رجسٹر نمبر آصفیہ (۱۲۰)
جلد (۴) عدد (۳)

رجسٹر نمبر ایم (۲۹۵۰)
ربیع الاول ۱۳۵۳ھ

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ) بیرون ہند کے لئے (سے) قیمت فی پرچہ (۸/)

الجہاد فی الاسلام

تالیف

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے۔ اس مسئلے پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کئے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لئے خود اسلام کے احکام اور اسکی تعلیمات میں قطع و برید شروع کردی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت (Apology) کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلے کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق انکی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اسکے مقاصد اور احکام کو تفصیل کیساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کرکے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے

"الجہاد فی الاسلام" نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام (International Law) کے متعلق ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لئے بالکل نئے ہیں۔ عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب نہ صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات۔ قیمت (سعہ) انگریزی۔ (سعہ ۱۱) سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمایئے

فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ جلد ۴ عدد ۳

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

اصلاح اور انقلاب دونوں کا مقصد کسی بگڑی ہوئی حالت کا بدلنا ہوتا ہے۔ لیکن دونوں کے محرکات اور طریق کار میں اساسی فرق ہوا کرتا ہے۔ اصلاح کی ابتدا غور و فکر سے ہوتی ہے، ٹھنڈے دل کے ساتھ سوچ بچار کر کے انسان حالات کا جائزہ لیتا ہے، خرابی کے اسباب پر غور کرتا ہے، خرابی کے حدود کی پیمائش کرتا ہے، اس کے ازالہ کی تدبیریں دریافت کرتا ہے، اور اس کو دور کرنے کے لئے صرف اسی حد تک تخریبی قوت استعمال کرتا ہے جس حد تک اس کا استعمال ناگزیر ہو۔ بخلاف اس کے انقلاب کی ابتدا غیظ و غضب اور جوش انتقام کی گرمی سے ہوتی ہے۔ خرابی کے جواب میں ایک دوسری خرابی مہیا کی جاتی ہے۔ جس بے اعتدالی سے بگاڑ پیدا ہوا تھا اس کا مقابلہ ایک دوسری بے اعتدالی سے کیا جاتا ہے جو خود بھی ایک دوسری قسم کا بگاڑ ہوتی ہے، اور تخریب کا عمل ایک ایسے جوش جنون کے ساتھ کیا جاتا ہے جو برائیوں کے ساتھ اچھائیوں کو بھی غارت کر دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات ایک اصلاح پسند کو بھی وہی کچھ کرنا پڑتا ہے جو ایک انقلاب پسند کرتا ہے۔ دونوں نشتر لیکر جسم کے ماؤف حصہ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ اصلاح پسند پہلے اندازہ کر لیتا ہے کہ خرابی کہاں ہے اور کتنی ہے۔ پھر نشتر کو اسی حد تک استعمال کرتا ہے جس حد تک خرابی کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے اور نشتر کے ساتھ ساتھ مرہم بھی تیار رکھتا ہے لیکن انقلاب پسند اپنے جوش غضب میں آنکھیں بند کر کے نشتر چلاتا ہے، اچھے برے کا امتیاز کئے بغیر کاٹتا چلا جاتا ہے، اور مرہم کا خیال اس کے ذہن میں اگر آتا بھی ہے تو اس وقت جب خوب

قطع و برید کر لیتے، اور جسم کے ایک اچھے خاصے حصے کو غارت کر چکنے کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

عموماً جہاں خرابیاں حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہیں، وہاں لوگ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے کھو بیٹھتے ہیں، اور بگڑے ہوئے حالات سے جو تکلیف ان کو پہنچتی ہے وہ انہیں اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر کے اصلاح کی کوشش کریں۔ اس لئے ایسے حالات میں عام طور پر اصلاحی تحریکات کے بجائے انقلابی تحریکات کا زور ہوتا ہے۔ قدامت پسند اور انقلاب پسند جماعتوں میں سخت کشمکش برپا ہوتی ہے جس سے غضب و انتقام کی آگ کو اور زیادہ ایندھن مل جاتا ہے۔ دونوں فریق ضد اور ہٹ دھرمی کے انتہائی سرے پر پہنچ جاتے ہیں۔ دونوں حق اور صداقت کا گلا کاٹتے ہیں۔ ایک طرف سے حق کے بجائے باطل کی مدافعت میں انتہائی قوت صرف کی جاتی ہے، دوسری طرف سے حق اور باطل کا امتیاز کئے بغیر سب پر اندھا دھند حملے کئے جاتے ہیں۔ آخر میں جب انقلاب پسندوں کو فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ ہر اس چیز کو تباہ کرتے ہیں جو قدامت پسندوں کے پاس تھی، خواہ وہ حق ہو یا باطل، صحیح ہو یا غلط۔ انقلاب ایک سیلاب کی طرح بڑھتا ہے اور بلا امتیاز اچھے اور برے سب کو غارت کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر کافی تخریب کر چکنے کے بعد جب عقل اپنے ٹھکانے پر واپس آتی ہے تو تعمیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مگر انقلابی ذہنیت تعمیر میں بھی نرالے انداز ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی ہے۔ ہر اس چیز کو چھوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے جو قدامت پسندوں کے پاس تھی، خواہ کوئی چیز بجائے خود صحیح ہو، لیکن انقلاب کی نگاہ میں کسی چیز کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی عیب نہیں کہ وہ قدامت پسندی کی طرف منسوب ہو۔ اس طرح ایک کافی مدت تک نئے انقلابی اصولوں پر زندگی کی عمارت قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور جب شکستہ تجربوں اور ناکامیوں سے انقلابی دماغ تھک جاتا ہے، تب کہیں جا کر وہ اس اعتدال کی طرف پلٹتا ہے جو ابتدا ہی سے اصلاح پسند کے پیش نظر تھا۔

آنچہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابی بسیار

موجودہ زمانہ میں اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال بولشویک انقلاب ہے۔ نظام تمدن کی جو انتہائی بگڑی ہوئی حالت شہنشاہی روس میں قائم تھی وہ جب اہل ملک کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی تو اس کے جواب میں ایک انقلابی تحریک رونما ہوئی۔ یورپ کے اشتراکی اور جمہوری نظریات نے روس میں فروغ پانا شروع کیا۔ سلطنت اور اس کے پروردہ طبقوں نے اپنے ناجائز فوائد کی حفاظت کے لئے جابرانہ قوتیں استعمال کیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انقلاب پسندوں میں صرف شاہی مطلق العنانی اور طبقات کی ناروا تقسیم ہی کے خلاف نہیں بلکہ اس پورے نظام تمدن کے خلاف جو صدیوں سے متوارث چلا آرہا تھا، غضب کے جذبات بھڑکنے لگے۔ آخر کارل مارکس کے ہیولیٰ نے لینن کی صورت اختیار کی۔ زار کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا گیا، اور اس کے ساتھ ان تمام سیاسی، معاشی، تمدنی، اخلاقی، مذہبی، اصولوں کو بھی یک قلم مٹا دیا گیا جن پر انقلاب سے پہلے کی سوسائٹی قائم تھی۔ اس کامل تخریب کے بعد بالکل نئے اشتراکی اصولوں پر ایک نئی سوسائٹی کی تعمیر شروع کی گئی، اور ان نئے معماروں نے اپنی تمام ذہنی قوتیں اس کوشش میں صرف کردیں کہ قدامت پسندوں کے ترکے میں سے ایک چیز بھی ان کی نئی عمارت میں شامل نہ ہونے پائے۔ حتیٰ کہ خدا کو بھی سوویٹ روس سے باہر نکل جانے کا نوٹس دیدیا گیا۔ لیکن اب جتنا جتنا زمانہ گذرتا جاتا ہے، تعمیری عقل، انقلابی جنون کی جگہ لیتی جاتی ہے، اور وہ انتہائی بولشویت جو انقلاب کی ابتدا میں کارفرما تھی، اعتدال کے نقطہ کی طرف واپس ہوتی رہتی ہے۔

ایسی ہی انتہا پسندی انقلاب فرانس کے زمانہ میں بھی رونما ہوئی تھی اس وقت بھی جوش انقلاب میں اچھے اور برے سب کو مٹانے کی کوشش کی گئی اور نئے نئے انقلابی اصول وضع کرکے ان کو رواج دیا گیا لیکن اس شدید انقلابی بحران کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک فرانس کا سیاسی، تمدنی، اور اخلاقی مزاج اعتدال

نہیں آسکا ہے اور آج اس کی قومی زندگی کو کسی شعبہ میں بھی وہ استحکام نصیب نہیں ہے جو انگلستان کو حاصل ہے۔ ایک اور مثال ترکی انقلاب کی ہے جہاں اسی انقلابی ذہنیت نے کوشش کی کہ ایک قوم کو جادو کے زور سے آن کی آن میں ایک دوسری قوم بنا دیا جائے۔ اس کوشش میں پھوڑوں اور پھنسیوں پر نشتر چلانے کے ساتھ جسم کے اچھے خاصے تندرست حصوں کو بھی کاٹ پھینکا گیا۔ اور ان کی جگہ یورپ سے کچھ نئے اعضا منگوا کر لگائے گئے، حتیٰ کہ پرانے دماغ کی جگہ بھی ایک نیا دماغ نئی ٹوپی کے ساتھ یورپ سے حاصل کیا گیا۔ لیکن اب مرور ایام کے ساتھ ساتھ انقلاب پسند ترکوں کو آہستہ آہستہ یہ سبق مل رہا ہے کہ ہر پرانی چیز کو برا اور ہر نئی چیز کو اچھا سمجھنے کا جو قاعدۂ کلیہ انہوں نے بنا لیا تھا، وہ درست نہیں ہے۔ چنانچہ اکثر نئے تجربوں سے کافی نقصان اٹھانے کے بعد ان کو افراط سے اعتدال کی طرف پسپا ہونا پڑا ہے۔

یہ سب کچھ اس لئے کہا گیا ہے کہ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں میں بھی ایک انقلابی بحران رونما ہے اور اس بحران کے برے نتائج ظاہر ہونے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ قدامت پسند اور انقلاب پسند دونوں جماعتوں کو غور و فکر کی دعوت دیں۔

یہاں حالات کا بگاڑ وہی ہے جو ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک میں تھا اور ہے۔ صدیوں سے ہماری مذہبی رہنمائی جس گروہ کے ہاتھ میں ہے اس نے اسلام کو ایک جامد و غیر متحرک چیز بنا دیا ہے۔ غالباً ساتویں صدی ہجری کے بعد سے اس گروہ کے ہاں جنتری بدلنی موقوف ہو گئی ہے۔ گو اب تک وہ اپنے فلسفے اور کلام کے مباحث میں یہی پڑھتے پڑھاتے ہیں کہ عالم متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہوتا ہے لیکن حقیقت میں عالم کے تغیر اور زمانہ کی نیرنگی اور وقت کے سیلان و تجدد سے انہوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ دنیا کہاں سے کہیں پہنچ گئی۔ دنیا کے حالات، خیالات، رجحانات، نظریات بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے، تمدن کے معاملات

اور مسائل نے کتنے ہی پلٹے کھائے، مگر ہمارے پیشوا اپنے آپ کو ابھی تک اسی ماحول میں سمجھ رہے ہیں جو پانچ چھ سو برس پہلے کا ماحول تھا۔ انہوں نے زمانہ کے ساتھ کوئی ترقی نہ کی۔ نئے تغیرات سے بے اثر رہے زندگی کے نئے مسائل سے کوئی غرض نہ رکھی۔ اور کوشش یہی کرتے رہے کہ اپنی قوم کو بھی زمانے کے ساتھ چلنے سے روک دیں، بلکہ مستقبل سے ماضی کی طرف کھینچ کر لے چلیں۔ یہ کوشش تھوڑی مدت تک کامیاب ہو سکتی تھی اور ہوئی۔ مگر دائماً ایسی کوششوں کا کامیاب ہونا مشکل ہے۔ جو قوم دنیا کے ساتھ میل جول اور معاملات رکھتی ہو، وہ کب تک دنیا کے افکار اور زندگی کے نئے مسائل سے غیر متأثر رہ سکتی ہے؟ اگر اس کے رہنما اس کے آگے آگے چل کر نئی عقلی علمی اور عملی راہوں میں اس کی رہبری نہ کریں گے، تو یہ بالکل فطری بات ہے کہ وہ ان کی قیادت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے پر آمادہ ہو جائے گی۔

اس خرابی کی جڑ دراصل ایک اور چیز ہے۔ ہمارے مذہبی رہنما فروع میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ اصول ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ پھر فروع نے اصول کی جگہ لے لی اور ان سے ہزار در ہزار فروع اور نکل آئے جو اصل اسلام قرار پا گئے، حالانکہ اسلام میں ان کی قطعاً کوئی اہمیت نہ تھی۔

ملت اسلامی کی عمارت دراصل اس ترتیب پر قائم ہوئی تھی کہ پہلے قرآن مجید پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔ پھر اہل علم و بصیرت کا اجتہاد لیکن بدقسمتی سے اس ترتیب کو بالکل الٹ دیا گیا، اور نئی ترتیب یوں قرار پائی کہ پہلے ایک خاص زمانہ کے اہل علم و بصیرت کا اجتہاد، پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور سب سے آخر میں قرآن یہی نئی ترتیب اس جمود کی ذمہ دار ہے جس نے اسلام کو ایک ساکن وغیر متحرک چیز بنا دیا ہے۔

فقہا، متکلمین، مفسرین، اور محدثین رحمہم اللہ اجمعین کے علم و فضل اور ان کی حیات شان سے کون

انکار کر سکتا ہے مگر وہ انسان تھے، اکتساب علم کے وہی ذرایع رکھتے تھے جو عام انسانوں کو حاصل ہیں۔ ان کے پاس وحی نہیں آتی تھی۔ بلکہ وہ اپنی عقل و بصیرت کے ساتھ، کلام اللہ و سنت رسول اللہ میں غور و فکر کرتے تھے اور جو اصول ان کے نزدیک متحقق ہو جاتے تھے۔ انہی سے وہ قوانین اور عقائد کے فروع مستنبط کر لیا کرتے تھے۔ ان کے یہ اجتہادات ہمارے لئے مددگار اور رہنما بن سکتے ہیں۔ مگر بجائے خود اصل اور منبع نہیں بن سکتے۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب علم کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا، کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔

تمام زمانی و مکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم ہے اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرہ برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ اس علم کا فیضان، قرآن کی آیات اور اس کے لانے والے کے سینے میں ہوا تھا۔ وہی درحقیقت ایسا ماخذ اور سرچشمہ بن سکتا ہے جس سے ہمیشہ ہر زمانہ کے لوگ اپنے مخصوص حالات اور اپنی ضروریات کے لحاظ سے علوم، افکار اور قوانین اخذ کرتے رہیں جب تک علماء اسلام اس اصل ماخذ و منبع سے اکتساب علم کرتے رہے اور صحیح غور و فکر سے کام لے کر اپنے اجتہاد سے علمی و عملی مسائل حل کرتے رہے، اس وقت تک اسلام زندہ طاقت کے ساتھ حرکت کرتا رہا۔ مگر جب قرآن میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا گیا، جب احادیث کی تحقیق اور چھان بین بند ہو گئی، جب آنکھیں بند کر کے پچھلے مفسرین اور محدثین کی تقلید کی جانے لگی، جب پچھلے فقہا اور متکلمین کے اجتہادات کو اٹل اور دائمی قانون بنا لیا گیا، جب کتاب و سنت سے براہ راست اکتساب علم ترک کر دیا گیا، اور جب کتاب و سنت کے اصول کو چھوڑ کر بزرگوں کے نکالے ہوئے فروع ہی اصل بنا لئے گئے تو اسلام کی ترقی دفعتاً رک گئی، اس کا قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے حامل اور وارث علم و عمل کے نئے میدانوں میں دنیا کی رہنمائی کرنے کے بجائے پرانے مسائل اور علوم کی شرح و تفسیر میں منہمک ہو گئے، جزئیات اور فروع میں جھگڑنے لگے، نئے نئے مذاہب نکالنے

اور دور از کار مباحث میں فرقہ بندی کرنے لگے، اور اس دریادلی کے ساتھ مسلمانوں میں کفر و فسق تقسیم کیا گیا کہ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کی جگہ يَخْرُجُوْنَ مِنْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کا تماشا دنیا نے دیکھا، اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کی جگہ رُحَمَآءُ عَلَى الْكُفَّارِ اَشِدَّآءُ بَيْنَهُمْ کے مناظر ہر طرف نمایاں ہوئے اور تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى کی جو کیفیت منافقین اور کفار کے حق میں بیان ہوئی تھی، وہ مسلمانوں کا حال بن گئی۔

یہ اسی فعل کا ردِ فعل ہے جو آج ہم ایک خوفناک انقلابی بحران کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ ان کے مذہبی رہنما ان کی قیادت کا فرض انجام نہیں دیتے، بلکہ آگے بڑھانے کے بجائے انہیں الٹا پیچھے کھینچے لئے جاتے ہیں تو وہ ان کے قابو سے نکلنے لگے، اور جیسا کہ ایک بن سری فوج کا حال ہوتا ہے، انہوں نے ہر وادی میں بھٹکنا شروع کر دیا۔ ایک گروہ نے مذہب کے علمبرداروں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا سارا الزام خود مذہب پر تھوپا، اپنی ترقی کی راہ میں اسی کو سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا، اور علانیہ کہنا شروع کیا کہ مذہب کو چھوڑو اور ترقی یافتہ قوموں کی تقلید کرو۔ ایک دوسرے گروہ نے علما اور مذہبی پیشواؤں کو گالیاں دینا اپنا شعار بنا لیا۔ گویا اب اسی شتم اور زبان درازی میں مسلمانوں کی فلاح و ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ ایک اور گروہ اٹھا اور اس نے مذہب کی قطع و برید شروع کر دی۔ کسی نے فقہا اور ائمہ پر زبان طعن دراز کی، کسی نے فقہ کے ساتھ حدیث کو بھی لپیٹ میں لے لیا، کسی نے قرآن کے احکام اور تعلیمات میں بھی ترمیم کی ضرورت سمجھی۔ کسی نے کہا کہ دین اور دنیا کو الگ الگ کر دو۔ دین کا تعلق صرف عقائد اور عبادات سے رہنا چاہئے، باقی رہے دنیوی معاملات تو ان میں مذہب اور اس کے قوانین کا کچھ دخل نہیں۔

اس طرح مختلف جماعتیں ان بگڑے ہوئے حالات کو بدلنے کے لئے کھڑی ہوگئی ہیں۔ مگر ان کا رجحان

اصلاح کی جانب نہیں بلکہ انقلاب کی جانب ہے۔ انہوں نے ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا کہ اصل خرابی کیا ہے؟ کہاں سے پیدا ہوئی؟ کس حد تک خرابی ہے؟ اور اس کی اصلاح کی صحیح صورت کیا ہے؟ محض تخمیناً یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ خرابی ہے، اور اس کو دور کرنے کے لئے دیوانہ وار نشتر چلائے جارہے ہیں خواہ اس سے مرض کے ساتھ مریض کا بھی کیوں نہ خاتمہ ہو جائے۔

آزاد ممالک میں تو کہا جا سکتا ہے، اور یہ کہنا ایک حد تک درست بھی ہے کہ کسی انقلابی حرکت کے بغیر چارہ نہیں۔ اس لئے کہ وہاں ایک گروہ کے ہاتھ میں حکومت کا عملی اقتدار ہوتا ہے اور دوسرا گروہ اس اقتدار کو مٹانے میں ایک شدید انقلابی حرکت کے بغیر مشکل سے کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ انقلاب کی کامیابی کے بعد جب معاملات کی ذمہ داری انقلاب کے رہنماؤں پر آن پڑتی ہے تو زمانے کے تجربات بہت جلدی ان کی عقل درست کر دیتے ہیں، اور انہیں مجبوراً افراط کی روش چھوڑ کر اعتدال کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہم اس وقت غلامی کی حالت میں ہیں، اور ہمارے حالات آزاد ممالک سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں اول تو کسی انقلابی حرکت کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ ایسی کسی شدید اور طاقت ور مزاحمت کا خوف نہیں ہے جس کے مقابلہ میں ایک معتدل اصلاحی تحریک کامیاب نہ ہو سکتی ہو۔ دوسرے اگر کوئی انقلابی حرکت جاری ہو اور وہ کامیاب ہو جائے تو مدتہائے دراز تک اس کے اعتدال پر آنے کی امید نہیں کی جا سکتی کیونکہ انقلاب کے علمبرداروں پر سرے سے کسی ذمہ داری کا بوجھ ہی نہ ہوگا۔ جو ان کی افراط پسندی کو اعتدال کی طرف مائل کر سکتا ہو۔ لہٰذا یہاں کسی انقلابی حرکت، بلکہ صحیح الفاظ میں بہت سی انقلابی حرکات کے دیر تک جاری رہنے کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ اسلامی سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ سب کی سب متزلزل ہو جائیں گی اور ان کی جگہ کوئی ایسی مستحکم بنیاد قائم نہ ہو سکے گی جس پر از سر نو ایک

نظام اجتماعی تعمیر کیا جاسکے۔ پھر غور کرنا چاہیئے کہ جو قوم پہلے ہی غلامی اور کمزوری کی حالت میں ہے، اس کے نظام اجتماعی کو اگر اس طرح منہدم کرکے پارہ پارہ کردیا گیا تو وہ ذلت کے کن گڑھوں میں جا کر گر جائیگی؟

یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ہم قدامت پسندوں سے زیادہ انقلاب پسندوں کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، ورنہ جہاں تک بگڑے ہوئے حالات کا تعلق ہے ان کو بدلنے کی ضرورت میں ہم بھی ان سے متفق ہیں۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ جو جمود اسلام میں پیدا کردیا گیا ہے اس کو حرکت سے بدل دیا جائے لیکن ہمارے نزدیک اس حرکت کے پیدا کرنے کی یہ کوئی صحیح تدبیر نہیں ہے کہ اسلامی شعائر کو چھوڑ کر فرنگیت اختیار کیجائے۔ نہ اسکی یہ تدبیر ہے کہ علم و تحقیق اور غور و فکر کے بغیر مذہب کی قطع و برید شروع کردی جائے۔ نہ اسکی تدبیر یہ ہے کہ گذشتہ زمانے کے مجتہدین نے اپنی محنتوں اور کاوشوں سے جو عمارتیں قائم کی تھیں ان کو خواہ مخواہ ڈھا دیا جائے۔ نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ حدیث کے سارے ذخیرہ کو آگ میں جھونک دیا جائے۔ نہ اس کی یہ تدبیر ہے کہ کلام الٰہی میں انسان اپنی عقل سے ترمیم و تنسیخ کریں۔ یہ سب تدبیریں تو اصلاح کی نہیں بلکہ پہلے سے بھی زیادہ سخت فساد برپا کرنے کی تدبیریں ہیں۔ صحیح علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جس ترتیب کو الٹ دیا گیا ہے اسے پھر سے سیدھا کردیا جائے۔ قرآن کو وہی پیشوائی کا مقام دیجئے جو دراصل اسکا مقام تھا۔ حدیث کو وہی مرتبہ دیجئے جو عہد رسالت میں خود رسول اکرمؐ اور آپ کے اصحاب و اہل بیت آپ کے اقوال و اعمال کو دیتے تھے۔ فقہاء، متکلمین، مفسرین اور محدثین کے کارناموں کو وہی مرتبہ دیجئے جو خود ان بزرگوں نے دیا تھا۔ ان سے فائدہ اٹھائیے، جن چیزوں کے بدلنے کی ضرورت نہیں ہے انہیں بدستور رہنے دیجئے، مگر کبھی یہ نہ سمجھئے کہ جو کچھ وہ لکھ گئے ہیں وہ اٹل قانون ہے، یا ان کی کتابوں نے ہم کو قرآن مجید میں غور و فکر اور احادیث نبوی کی تحقیق سے بے نیاز کردیا ہے، یا ان کے بعد کتاب و سنت سے براہ راست اکتساب علم کا دروازہ بند ہوگیا ہے۔

یہ ترتیب اگر پھر سے قائم ہوجائے تو اسلام کی رکی ہوئی گاڑی پھر حرکت کرنے لگے گی۔ کیونکہ جمود کی اصلی وجہ تو یہی ہے کہ انجن ریل سے کاٹ کر پیچھے کھڑا کردیا گیا ہے ڈرائیور کو بھی انجن سے الگ کرکے کہیں پیچھے

کی گاڑیوں میں بٹھا دیا گیا ہے، اور سب سے آگے والی گاڑی پر بھروسہ کر لیا گیا ہے کہ وہ خود بھی چلے گی اور ساری ریل کو بھی چلائے گی۔

مگر اس کام میں غصے اور جوش کی ضرورت نہیں۔ غصہ تو وہاں ہو جہاں عمداً کوئی ظلم کیا گیا ہو اور یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے عمداً نہیں ہوا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ علمار نے کہیں کوئی کانفرنس کر کے طے کیا تھا کہ ہم اسلام پر جمود طاری کریں گے اور اس کی بڑھتی ہوئی گاڑی کو روکیں گے۔ یہ تو محض نتیجہ ہے اس انحطاط کا جو چھٹی ساتویں صدی سے مسلمان قوموں کی سیاسی، فوجی، معاشی، اور تمدنی قوتوں کے ساتھ ان کی علمی، عقلی، اور فکری قوتوں میں رونما ہو رہا ہے۔ اس انحطاط نے جس طرح مسلمانوں کی روح جہاد کو پژمردہ کیا اسی طرح ان کی روح اجتہاد کو بھی افسردہ کر دیا۔ جس طرح زندگی کے جملہ مسائل کے متعلق مسلمانوں کے نظریے بدلے اسی طرح امور دینی وعلمی کے متعلق بھی ان کے نظریے بدل گئے اور رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ان کی تمام ذہنی قوتوں پر مردنی چھاتی چلی گئی۔ اس کا الزام نہ علمار کو دیا جا سکتا ہے نہ ان کے متبعین کو۔ اگر آپ چاہیں تو فطرت پر اس کا الزام رکھ دیجئے۔ مگر نہ الزام رکھنے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے، اور نہ غضب اور اس کے تخریبی جوش سے۔ اصلاح کی صحیح صورت بس یہی ہے کہ ٹھنڈے دل سے خرابیوں کے اسباب اور ان کے حدود کو تلاش کیجئے اور حکمت کے ساتھ ان کو خوبیوں سے بدل دیجئے

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

(۱۴)

ایمان

(۵) ایمان بالیوم الآخر

یوم آخر سے مراد موت کے بعد کی زندگی ہے۔ اسی لئے اس کو حیات آخرت، اور دار آخرت بھی کہا گیا ہے۔ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جو اس دوسری زندگی کے ذکر سے خالی ہو۔ طرح طرح سے اس کو ذہن نشین کیا گیا ہے۔ اس کی صداقت پر دلائل قائم کئے گئے ہیں، اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اس کی اہمیت جتائی گئی ہے، اس پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو شخص اس اخروی زندگی پر ایمان نہیں لاتا اس کے اعمال غارت ہو جاتے ہیں وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَاءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۷: ۱۷) اور قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاءِ اللّٰهِ (۶: ۴)۔

حیات اخروی کا اعتقاد، جس کو اس شد و مد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، بعض ایسے سوالات کا جواب ہے جو فطری طور پر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

چند فطری سوالات انسان خوشی سے زیادہ غم، اور راحت سے زیادہ تکلیف و مصیبت کو محسوس کرتا ہے۔ اور یہ کچھ فطری بات ہے کہ جو چیز انسان کے حسیات کو جتنی زیادہ ٹھیس لگاتی ہے، وہ اتنی ہی زیادہ اس کی قوت فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ جب کوئی چیز ہم کو حاصل ہوتی ہے تو اس کی خوشی میں ہم یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ یہ کہاں سے آئی؟ کیونکر آئی؟ اور کب تک رہیگی؟ لیکن جب کوئی شے ہم سے کھوئی جاتی ہے تو اس کا صدمہ ہمارے توسن فکر پر ایک تازیانہ لگا دیتا ہے، اور ہم سوچنے لگتے ہیں کہ یہ کیسے کھوئی گئی؟ کہاں گئی؟

اب کہاں ہوگی؟ اور کیا یہ ہمیں کبھی پھر حاصل ہوگی یا نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ زندگی اور اس کے آغاز کا سوال ہمارے لئے اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت موت اور اس کے انجام کے سوال کو حاصل ہے۔ اگرچہ دنیا کی اس تماشا گاہ اور اس میں خود اپنے وجود کو دیکھ کر ہمارے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کیسا ہنگامہ ہے؟ کیسے شروع ہو گیا؟ کس نے برپا کر دیا؟ لیکن یہ سب فرصت کی باتیں ہیں، اور گہری فکر رکھنے والے خواص کو چھوڑ کر عام انسان ان سوالات میں کم الجھتے ہیں بخلاف اس کے موت اور اس کی تلخیوں سے ہر شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے، ہر شخص کی زندگی میں بہت سے موقع ایسے آتے ہیں جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیزوں، دوستوں اور پیاروں کو مرتے دیکھتا ہے بیکس اور کمزور بھی مرتے ہیں، طاقت اور ہیبت والے بھی مرتے ہیں، حسرتناک موتیں بھی واقع ہوتی ہیں، عبرتناک موتیں بھی پیش آتی ہیں، اور آخر میں ہر شخص کو خود اسی راہ پر اپنے گذرنے کا یقین ہوتا ہے جس پر سب گذرے ہیں۔ ان مناظر کو دیکھ کر شائد ہی کوئی انسان دنیا میں ایسا ہو جس کے دل میں موت کے سوال نے ایک الجھن پیدا نہ کی ہو، اور جس نے اس امر پر غور نہ کیا ہو کہ یہ موت کیا ہے؟ انسان اس دروازے سے گذر کر آخر کہاں چلا جاتا ہے؟ اور اس دروازے کے پیچھے کیا ہے؟ ملکہ کچھ ہے بھی یا نہیں؟

یہ تو ایک عالم سوال ہے جس پر عوام اور خواص سب نے غور کیا ہے۔ ایک معمولی کسان سے لیکر ایک بڑے سے بڑے فلسفی اور حکیم تک سب ہی اس میں الجھے ہیں لیکن اسی ضمن میں بعض اور سوالات بھی ہیں جو قریب قریب ہر صاحب فکر آدمی کے دل میں کھٹکتے ہیں۔ اور زندگی کے بہت سے تلخ واقعات اس کھٹک کو اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔ یہ چند برس کی زندگی جو ہم میں سے ہر شخص کو اس دنیا میں ملتی ہے، ہر لمحہ اور ہر آن کسی نہ کسی کام، کسی نہ کسی سعی، اور کسی نہ کسی حرکت میں بسر ہوتی ہے جس کو ہم سکون سمجھتے ہیں وہ بھی ایک حرکت ہے، جس کو ہم بیکاری خیال کرتے ہیں وہ بھی ایک کام ہے۔ ان میں سے ہر فعل کا ردِ فعل، ہر حرکت کی بازگشت، ہر کوشش کا ثمرہ اور ہر سعی کا انجام ضرور ہونا چاہئے۔ نیکی کا پھل نیک اور بدی کا پھل برا ملنا لازم ہے۔ اچھی کوشش کا

اچھا نتیجہ اور بری کوشش کا برا نتیجہ ظاہر ہونا ضروری ہے۔ مگر کیا ہماری تمام کوششوں کے نتائج، تمام مساعی کے ثمرات، تمام افعال کے جواب ہماری اس زندگی میں ہم کو مل جاتے ہیں؟ ایک بدکار نے تمام عمر شرارتوں میں گذاری بعض شرارتوں کا پھل بلاشبہ اس کو دنیا میں مل گیا، کسی شرارت نے اسے بیماری میں مبتلا کر دیا، کسی شرارت نے اس کو تکلیفوں اور مصیبتوں اور پریشانیوں میں پھنسا دیا۔ مگر بہت سی شرارتیں ایسی بھی تو رہ گئیں جن کا پورا پورا بدلہ اس کو دنیا میں نہ ملا۔ بہت سی شرارتیں ایسی ڈھکی چھپی رہیں کہ ان کی وجہ سے اس کی بدنامی اور رسوائی تک نہ ہوئی۔ اور اگر بالفرض بدنامی ہوئی بھی تو جس غریب پر اس نے ظلم کیا تھا اس کے نقصان کی کونسی تلافی ہوئی؟ پھر کیا اس شریر کے یہ ظلم، اور مظلوموں کے صبر سب کے سب بے نتیجہ ہی رہیں گے؟ کیا ان کا کوئی انجام کبھی ظاہر ہی نہ ہوگا؟ یہی حال نیکیوں کا بھی ہے، بہت سے نیک انسان عمر بھر نیکی کرتے رہے، اور ان کا پورا پورا ثمرہ انھیں دنیا میں نہ ملا بعض نیکیوں پر ان کی الٹی بدنامی اور رسوائی ہوئی بعض نیکیوں پر وہ ستائے گئے۔ بعض نیکیوں پر انہیں سزائیں ملیں بعض نیکیوں کا حال کبھی دنیا پر کھلا ہی نہیں۔ پھر کیا ان غریبوں کی سب نیکیاں اکارت گئیں؟ کیا اتنی سخت محنتوں اور کوششوں کا صرف اتنا ہی ثمرہ کافی ہے کہ انہیں ضمیر کا اطمینان نصیب ہوگیا؟

یہ سوال تو صرف اشخاص اور افراد سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے بعد ایک اور سوال انواع اور اجناس اور عناصر اور اس تمام عالم کے انجام سے بھی تعلق رکھتا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی مرتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں۔ درخت اور جانور سب فنا ہوتے ہیں۔ اور ان کی جگہ دوسرے درخت اور جانور پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر کیا مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہیگا؟ کیا کہیں پہنچ کر یہ ختم نہ ہوگا؟ یہ ہوا، یہ پانی، یہ زمین، یہ روشنی یہ حرارت، اور یہ قدرتی طاقتیں جن کے سہارے یہ کارخانۂ عالم ایک خاص ڈھنگ پر چل رہا ہے، کیا یہ سب لازوال ہیں؟ کیا ان کے لئے کوئی عمر مقرر نہیں ہے؟ کیا ان کے نظم اور ان کی ترتیب میں کبھی کوئی تغیر واقع نہ ہوگا؟

اسلام نے ان تمام سوالات کو حل کیا ہے، اور حیات اخروی کا اعتقاد دراصل ان ہی سوالات کا جواب ہے لیکن اس حل اور اس کی صداقت اور اس کے اخلاقی و تمدنی نتائج پر بحث کرنے سے پہلے دیکھنا چاہیے کہ خود انسان نے ان سوالات کو حل کرنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ کس حد تک کامیاب ہیں؟

حیات اخروی کا انکار ایک جماعت کہتی ہے کہ زندگی جو کچھ بھی ہے یہی دنیا کی زندگی ہے، اور موت کے معنی بالکل فنا اور معدوم ہو جانے کے ہیں جس کے بعد حیات، شعور، احساس، عمل اور نتائج کچھ بھی نہیں۔ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ (۴۴: ۲)، وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ (۴۵: ۳) بخلاف اس کے یہ کارخانہ عالم جس طرح چل رہا ہے یونہی چلتا رہے گا۔ اس نظام میں ایسی پائداری ہے کہ یہ کبھی درہم برہم ہونے والا نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ اس بنا پر نہیں کہتے کہ ان کو کسی ذریعۂ علم سے تحقیق ایسا معلوم ہو گیا ہے کہ فی الواقع موت کے بعد کچھ نہیں ہے، اور فی الواقع یہ کارخانہ عالم لازوال ہے بلکہ دراصل انہوں نے محض اپنے حواس پر اعتماد کیا ہے، اور یہ رائے اس لئے قائم کی ہے کہ موت کے بعد کی کوئی کیفیت ان کو محسوس نہیں ہوئی، اور نظام عالم کی برہمی کے کوئی آثار انہوں نے نہیں دیکھے مگر کیا ہمارا کسی شے کو محسوس نہ کرنا اس کے انکار کے لئے کافی دلیل ہے؟ کیا ہمارا احساس ہی دراصل اشیا کا وجود اور ہمارا عدم احساس ہی اشیاء کا عدم ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جو چیز جس وقت میرے احساس میں آتی ہے، وہ دراصل اسی وقت وجود میں آتی ہے، اور جب وہ میرے حواس سے غائب ہو جاتی ہے تو وہ دراصل فنا ہو جاتی ہے۔ میں نے جس دریا کو بہتے دیکھا تھا وہ اسی وقت پیدا ہوا جب میں نے اسے بہتے دیکھا، اور جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو معدوم ہو گیا۔ کیا کوئی صاحب عقل آدمی میرے اس قول کو صحیح مان لے گا؟ اگر نہیں، تو کوئی صاحب عقل آدمی اس قول کو کیسے صحیح مان سکتا ہے کہ موت کے بعد کی کیفیت چونکہ ہم کو معلوم نہیں اس لئے موت کے بعد سرے سے کوئی کیفیت ہی نہیں ہے

پھر جس طرح موت اور فنا کے متعلق محض حواس پر بھروسہ کر کے حکم لگانا غلط ہے، اسی طرح زندگی اور بقا کے متعلق بھی جو احکام محض حواس کے بل پر لگائے جاتے ہیں، ان کا کچھ اعتبار نہیں۔ اگر کارخانۂ عالم کے دائمی اور لازوال ہونے کا حکم محض اس بنا پر لگانا درست ہے کہ ہم نے اس کو درہم برہم ہوتے نہیں دیکھا، تو میں بھی ایک مضبوط عمارت کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی کیونکہ میں نے نہ اس کو گرتے دیکھا ہے اور نہ اس میں کوئی بوسیدگی مجھے نظر آتی ہے جو اس کے کبھی آئندہ گرنے کی پیش گوئی کرتی ہو کیا میرا یہ استدلال ارباب عقل کی بارگاہ میں مقبول ہوگا؟

اخلاق پر انکار آخرت کا اثر فلاسفہ اور حکماء اب قریب قریب اس خیال پر متفق ہو چکے ہیں کہ ایک نہ ایک دن نظام عالم ضرور درہم برہم ہوگا۔ عالم کی ازلیت اور ابدیت کے قدیم فلسفیانہ نظریہ کو دہرانے والا شاید آج اہل علم کی جماعت میں کوئی بھی نہیں ہے تاہم ابھی تک موت کو فنائے محض کہنے والے بہت سے باقی ہیں اور ان کے اس قول کی بنا وہی غیر معقول بات ہے جو ابھی اوپر بیان ہوئی لیکن اس کی غیر معقولیت سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قول سے انسان کو کبھی تسلی حاصل نہیں ہو سکتی اور بہت سے وہ سوالات جو زندگی کے معاملات کو دیکھ کر دل میں پیدا ہوتے ہیں، اس قول میں تشنۂ جواب ہی رہ جاتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر انسان کے اخلاق اور اس کی سیرت کی تعمیر اس اعتقاد پر قائم ہو، تو یقیناً وہ دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ ناموافق حالات میں اس پر ایک شدید قسم کی مایوسی اور پست ہمتی انسان پر طاری ہو گی کیونکہ جب وہ اپنی نکوکاری کا کوئی نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتے نہ دیکھے گا۔ تو اس کی قوت عمل سرد پڑ جائیگی جب وہ اپنی مظلومی کی دادرسی کا کوئی ذریعہ دنیا میں نہ پائیگا تو اس کا دل ٹوٹ جائیگا۔ اور جب وہ شریروں بدکاروں اور ظالموں کو دنیا میں پھلتے پھولتے دیکھیگا تو خیال کریگا کہ عالم ہستی میں شر ہی کا بول بالا ہے اور خیر صرف نیچا ہی دیکھنے کے لئے ہے۔

بخلاف اس کے اگر حالات موافق ہوں تو اس اعتقاد کے اثر سے انسان ایک نفس پرست حیوان بن جائیگا۔ وہ خیال کریگا کہ زندگی کے جو دن عیش اور لطف میں بسر ہو جائیں بس وہی غنیمت ہیں۔

اگر دنیا کی کسی لذت اور کسی لطف سے محروم رہ گئے تو پھر کوئی زندگی نہیں جس میں اکی کسر پوری ہو وہ ظلم و ستم کر سکیگا لوگوں کے حقوق غصب کریگا، اپنے فائدے اور اپنے نفس کی خواہشات کے لئے کوئی بدتر سے بدتر فعل کرنے میں بھی اس کو باک نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ نیکی اور شرافت جو ایسے شخص کے تصور میں آسکتی ہے وہ بس وہی ہے جس کے اظہار سے نیک نامی، شہرت، عزت، یا اور کسی قسم کے دنیوی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ صرف ایسے ہی جرائم کو جرائم اور ایسے ہی گناہوں کو گناہ سمجھے گا جن کا نتیجہ کسی دنیوی سزا یا جسمانی عقوبت یا مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔ رہیں وہ نیکیاں جن کا کوئی نفع اس دنیا میں ظاہر ہونے والا نہ ہو، تو وہ اس کے نزدیک حماقت سے کم نہ ہونگی۔ اور وہ برائیاں جن کا کوئی نقصان اس دنیا میں عائد ہونے والا نہ ہو، تو وہ اس کے نزدیک عین صواب ہوں گی۔

اگر کہیں پوری سوسائٹی کا نظام اخلاق اسی اعتقاد اور اسی ذہنیت پر قائم ہو، تو سرے سے اس کے اخلاقی تصورات ہی بدل جائیں گے۔ اس کا پورا نظامِ اخلاق خود غرضی اور نفسانیت کی بنیاد پر تعمیر ہوگا۔ نیکی محض دنیوی فائدہ کی ہم معنی ہوگی اور بدی محض دنیوی نقصان کی مترادف ہو کر رہ جائیگی۔ جھوٹ اگر دنیا میں نقصان کا موجب ہو تو گناہ ہوگا، اور فائدہ کا ذریعہ ہو تو عین صواب بن جائیگا۔ صداقت اگر دنیا میں جلب منفعت کا ذریعہ ہو تو نیکی ہوگی، ورنہ بصورتِ نقصان اس سے بڑھ کر کوئی بدی نہ ہوگی۔ زنا لذت اور عیش کے لئے مستحسن ہوگی، اور اس میں برائی کا پہلو اگر کبھی پیدا ہوگا بھی تو صرف اس وقت جبکہ وہ صحت کے لئے موجب نقصان ہو۔ غرض جہاں اس دنیوی زندگی سے آگے کسی اچھے یا برے نتیجے کے مترتب ہونے کا خوف یا امید نہ ہو، وہاں انسان افعال کے صرف انہی نتائج پر نظر رکھے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہونے والے ہیں، اور اس سے اعمال کی اخلاقی قدروں میں ایسا تغیر واقع ہو جائیگا۔ جو ہرگز کسی مہذب انسانی سوسائٹی کے لئے سازگار نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایسے اخلاقی معیاروں کے ساتھ کوئی انسانی گروہ جانوروں سے بھی زیادہ بدتر درجہ تک گر جائیگا

نہیں رہ سکتا۔

آپ کہیں گے کہ سزا اور جزا کے لئے دنیا میں صرف مادی وجسمانی نقصانات اور فوائد ہی نہیں ہیں بلکہ خود انسان کے اندر بھی ایک قوت موجود ہے جس کا نام "ضمیر" ہے۔ اس کی ملامتیں اور اس کی بے اطمینانی اس دنیا میں بدی کے لئے کافی سزا ہیں۔ اور اس کا اطمینان انسان کے لئے نیکی کا کافی معاوضہ ہے لیکن اول تو بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کے مادی فوائد انسان کو ضمیر کی سرزنش برداشت کرنے کے لئے آمادہ کر دیتے ہیں، اور بہت سی نیکیوں کے لئے انسان کو اتنی قربانی کرنی پڑتی ہے کہ محض ضمیر کا اطمینان ان کا پورا معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اگر آپ ضمیر کی حقیقت پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کا کام اخلاقی تصورات پیدا کرنا نہیں ہے، بلکہ جو اخلاقی تصورات ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت سے انسان کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں انہی کی تائید اس کا ضمیر کرنے لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک ہندو کا ضمیر جن باتوں پر سرزنش کرتا ہے، ایک مسلمان کا ضمیر ان پر سرزنش نہیں کرتا پس اگر کسی سوسائٹی کے اخلاقی تصورات بدل جائیں اور خیر و شر کے معیار متغیر ہو جائیں تو ان کے ساتھ ساتھ ضمیر کا رخ بھی پھر جائیگا اور وہ نہ ان افعال پر سرزنش کریگا جن کو اب اس سوسائٹی نے گناہ سمجھنا چھوڑ دیا ہے، اور نہ ان افعال میں اطمینان محسوس کریگا جن کو اب یہ سوسائٹی نیکی ہی نہیں سمجھتی۔

نظریۂ تناسخ دوسری جماعت وہ ہے جس نے تناسخ کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ موت کے معنی فنائے محض کے نہیں ہیں بلکہ محض تبدیل جسم کے ہیں۔ روح اس جسم سے مفارقت کرنے کے بعد کوئی دوسرا جسم اختیار کرتی ہے، اور وہ دوسرا جسم یا زیادہ صحیح الفاظ میں دوسرا قالب اس قابلیت کی مناسبت سے ہوتا ہے جو انسان نے اپنی پہلی زندگی میں اپنے اعمال اور اپنے رجحانات سے بہم پہنچائی ہے۔ اگر اس کے اعمال برے رہے ہیں اور ان کے اثر سے اس کے نفس میں بری قابلیتیں پیدا ہو گئی ہیں تو اس کی روح ادنیٰ درجہ کے حیوانی یا نباتی طبقات میں چلی جائے گی، اور اگر اچھے اعمال سے اچھی قابلیتیں

اس نے بہم پہونچائی ہیں تو روح اعلیٰ طبقوں کی طرف ترقی کرے گی۔ غرض اس نظریہ کی رو سے جزا اور سزا جو کچھ بھی ہے اس دنیا اور انہی اجسام کے عالم میں ہے۔ ارواح بار بار اسی دنیا میں قالب بدل بدل کر آتی ہیں تاکہ اپنے پچھلے اعمال کے نتائج بھگتیں۔

یہ نظریہ ایک زمانہ میں بہت مقبول رہا ہے۔ یونان میں مسیح سے کئی صدی قبل فیثاغورس اور انبذقلس (Empedocles) وغیرہ اس کے قائل تھے، روم میں بھی مسیحیت سے پہلے اس کا چرچا تھا، مصر کی قدیم تاریخ میں بھی اس کے کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔ یہودیوں میں بھی بیرونی اثرات سے تناسخ کا عقیدہ داخل ہو گیا تھا۔ لیکن اب یہ اعتقاد یا تو ہندی الاصل مذاہب (برہمنیت، بودھ مت، جین مت وغیرہ) میں پایا جاتا ہے، یا پھر مغربی افریقہ، جنوبی افریقہ، مدغاسکر، وسطی آسٹریلیا، انڈونیشیا، اوشیانیا، شمالی و جنوبی امریکہ وغیرہ کی وحشی یا نیم وحشی قوموں میں۔ باقی تمام مہذب قومیں اس کو رد کر چکی ہیں، کیونکہ انسان نے اب تک علم و عقل کی ترقی سے دنیا اور اس کی زندگی کے متعلق جس قدر واقفیت بہم پہونچائی ہے وہ ان تمام نظریات کی تردید کرتی ہے جن پر نظریہ تناسخ کی بنا قائم ہے۔ خود ہندی الاصل مذاہب میں بھی جب ہم اس نظریہ کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ویدک ہندوستان میں یہ تخیل سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ اس زمانہ کے آریوں کا عقیدہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد انسان کو ایک دوسری زندگی ملتی ہے جو نیکوکاروں کے لئے سراسر راحت اور بدکاروں کے لئے سراسر مصیبت ہے۔ اس کے بعد دفعۃً اس نظریہ میں تغیر واقع ہوتا ہے، اور دوسرے دور کے ہندوستانی لٹریچر میں ہم کو وہ کتابیں ملتی ہیں جن میں تناسخ کا نظریہ ایک فلسفیانہ اعتقاد کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ اس تغیر کا سبب ابھی تک محقق نہیں ہو سکا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ تخیل آریوں میں قدیم دراوڑ قوموں سے آیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ خود آریوں کے ادنیٰ طبقوں میں موجود تھا، اور انہی سے بعد کے برہمن فلسفیوں نے اس کو لیکر تخیلات اور قیاسات کی ایک پوری عمارت اس پر قائم کر دی۔ اسی طرح بودھ مذہب بھی ابتداءً تناسخ کی اس مفصل اسکیم سے خالی تھا جو بعد کے بودھی لٹریچر میں پائی جاتی

ہے۔ جہاں تک قدیم لٹریچر سے پتہ چلتا ہے، ابتدا میں بودھ دھرم کا نظریہ یہ تھا کہ وجود ایک دریا ہے جو مسلسل تغیر اور انقلاب کی شان سے بہتا چلا جا رہا ہے۔ اسی تخیل نے آگے چل کر یہ صورت اختیار کی کہ تمام عالم کی ایک ہی روح اور تمام عالم میں ایک ہی وجود ہے جو صورتوں پر صورتیں اور قالب پر قالب بدلتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدا میں وحی و الہام کے سرچشمے سے ہندی قوموں کو جو علم حاصل ہوا تھا، اس کو انہوں نے بدل کر ایک ایسا فلسفیانہ مذہب ایجاد کر لیا جو محض ان کی اپنی اپج کا نتیجہ تھا۔

عقلی تنقید یہاں تناسخ کے مسئلہ پر کسی مفصل بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر اس کی غلطی واضح کرنے کے لئے اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ عقیدہ تناسخ کی بنیاد ایسے نظریات پر ہے جو صریح عقل کے خلاف ہیں اور ان تمام علوم کے منافی ہیں جو اب تک انسان کی دنیا اور اس کی زندگی پر غور و خوض کرنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ اہل تناسخ کا خیال ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا نتیجہ اسی دنیا میں اس طرح ملتا ہے کہ وہ اپنے اچھے اعمال کی بدولت زندگی کے اعلیٰ طبقات کی طرف صعود کرتا ہے اور برے اعمال کی بدولت ادنیٰ طبقات کی طرف اتر جاتا ہے۔ مثلاً اگر انسان نے اس زندگی میں برے عمل کئے تو وہ حیوانی اور نباتی طبقات کی طرف نزول کریگا۔ اور اگر حیوان نے اپنی زندگی میں اچھے عمل کئے تو وہ انسانی طبقات کی طرف صعود کرے گا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ حیوانی اور نباتی زندگی نتیجہ ہے انسانی زندگی کے برے اعمال کا اور انسانی زندگی نتیجہ ہے۔ نباتی اور حیوانی زندگی کے اچھے اعمال کا۔ یا بالفاظ دیگر اس وقت جو انسان ہیں وہ اس لئے انسان ہیں کہ پہلے انہوں نے نباتی اور حیوانی زندگی میں اچھے اعمال کئے تھے۔ اور اس وقت جو نباتات اور حیوانات ہیں وہ اس لئے ایسے ہیں کہ انہوں نے انسانی زندگی میں برے اعمال کئے تھے۔ اس نظریہ کو ماننے کے لئے چند اور باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ اور وہ سب علم و عقل کے خلاف ہیں۔ مثلاً

۱۔ تناسخ کا یہ چکر ایسا ہے جس کا کوئی آغاز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انسان ہونے کے لیے لازم ہے کہ اس سے پہلے نبات اور حیوان ہو اور نبات اور حیوان ہونے کے لیے لازم ہے کہ ان سے پہلے انسان ہو۔ یہ کھلا ہوا دور ہے جس کو عقل محال قرار دیتی ہے۔

۲۔ اگر تناسخ کا چکر ازلی اور ابدی ہے تو ماننا پڑیگا کہ نہ صرف وہ ارواح جو بار بار قالب بدلتی ہیں، بلکہ وہ مادے بھی جو ان ارواح کو قالب مہیا کرتے ہیں ازلی اور ابدی ہوں، اور یہ زمین اور یہ نظام شمسی اور یہ قوتیں جو اس نظام میں کام کر رہی ہیں، یہ سب بھی ازلی اور ابدی ہوں لیکن عقل کا دعویٰ ہے اور علمی تحقیقات اس پر شہادت دیتی ہے کہ ہمارا نظام شمسی نہ ازلی ہے اور نہ ابدی۔

۳۔ ماننا پڑے گا کہ نباتات حیوانات اور نوع بشری کی جتنی امتیازی خصوصیات ہیں وہ سب دراصل ان کے اجسام کے خاصے ہیں نہ کہ نفوس کے۔ اس لئے کہ جو نفس انسان کے قالب میں عقل و فکر کی قوتیں رکھتا تھا، وہ حیوان کے قالب میں پہنچکر لاعقل ہو گیا۔ اور نباتی قالب میں پہنچکر اس غریب سے حرکت ارادی کی قوت بھی سلب ہو گئی۔

۴۔ نیک اور بد کا اطلاق دراصل ان اعمال پر ہوتا ہے جو سوچ سمجھکر بالارادہ کئے جائیں۔ اس لحاظ سے انسان کے اعمال تو نیک اور بد ہو سکتے ہیں اور ان پر جزا و سزا مترتب ہو سکتی ہے لیکن نباتات اور حیوانات کے اعمال پر نہ تو نیکی اور بدی کا اطلاق جائز ہے، اور نہ ان پر جزا و سزا مترتب ہونے کی کوئی معقول وجہ ہے۔ ایسا حکم لگانے کے لئے یہ ماننا ضروری ہوگا کہ نباتات اور حیوانات میں بھی سوچ سمجھ کر بالارادہ فعل کرنے کی قوت ہے۔

۵۔ اگر بعد کی زندگی ہمارے موجودہ جنم کے کرموں کا پھل ہے تو ظاہر ہے کہ برُے کرموں کا پھل برا ہی ہونا چاہئے۔ اور جب وہ دوسرے جنم میں وہ برُا پھل ہم کو ملا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس برُے پھل سے نیک اعمال صادر ہوں؟ لامحالہ اس سے برُے ہی اعمال صادر ہوں گے، اور پھر ان کا پھل

تیسرے جنم میں اور بھی زیادہ برا ہوگا۔ اس طرح بدکار انسان کی روح تناسخ کے چکر میں نیچے اور نیچے طبقوں ہی کی طرف گرتی چلی جائے گی۔ اس کے پھر ابھر کر آنے کی کبھی توقع نہیں کی جا سکتی۔

تمدن پر عقیدۂ تناسخ کا اثر | ان کے علاوہ اور بہت سے وجوہ ہیں جن کی بنا پر عقل سلیم تناسخ کے اعتقاد کو قبول نہیں کر سکتی یہی وجہ ہے کہ انسان عقل اور علم میں جتنی جتنی ترقی کرتا گیا، تناسخ کا اعتقاد باطل ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ اب وہ زیادہ تر ان قوموں میں باقی رہ گیا ہے جو عقلی اور علمی ترقی میں بہت پسماندہ ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تناسخ کا اعتقاد ہمتوں کو پست کرنے والا، اور ترقی کی روح کو مردہ کرنے والا اعتقاد ہے۔ اسی اعتقاد سے "اہنسا" کا عقیدہ نکلا ہے جو انسان کی شخصی اور قومی زندگی کے لئے حد درجہ مہلک ہے۔ جو قوم اس عقیدہ کی قائل ہو اس کی جنگی اسپرٹ فنا ہو جاتی ہے۔ اس کی جسمانی قوتیں مضمحل ہو جاتی ہیں، وہ قوائے جسمانی کو نشو و نما دینے والی بہترین غذاؤں سے محروم ہو جاتی ہے، اس کے افراد نہ صرف جسمانی اعتبار سے کمزور بلکہ دماغی قوتوں کے لحاظ سے بھی ضعیف ہوتے ہیں، اور اس دوہرے ضعف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مغلوب و محکوم ہو کر رہتی ہے، اور آخر کار یا تو صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے یا دوسری طاقتور قوموں میں جذب ہو جاتی ہے۔

عقیدۂ تناسخ کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ وہ تمدن و تہذیب کا دشمن ہے۔ اور انسان کو رہبانیت اور ترک دنیا کی طرف لیجاتا ہے۔ اہل تناسخ کا اعتقاد یہ ہے کہ روح کو جو چیز گناہوں سے آلودہ کرتی ہے وہ خواہش ہے۔ اسی کی بدولت روح کو بار بار جسمانی قالبوں میں آکر اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ اگر انسان خواہشات کو پامال کر دے اور اپنے آپ کو دنیا اور اس کے دھندوں میں نہ پھنسائے تو اس کی روح کو آواگون کے چکر سے نجات مل سکتی ہے، اور نجات کی بس یہی ایک صورت ہے کیونکہ دنیوی زندگی کے معاملات میں پھنسنے کے بعد انسان کا خواہشات اور ان کے مقتضیات سے بچ جانا محال ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ نجات کے طالب ہوں وہ سنیاسی بن کر جنگلوں اور پہاڑوں

میں جا بیٹھیں۔ اور جو ایسا نہ کریں وہ نجات سے مایوس ہو کر جانوروں اور درختوں کے طبقات میں جانے کے لئے مستعد ہو جائیں۔ کیا یہ تخیل تمدن و تہذیب کی ترقی میں کسی طرح مددگار ہو سکتا ہے؟ اور کیا کوئی قوم یہ اعتقاد رکھ کر دنیا میں ترقی کر سکتی ہے؟

اس میں شک نہیں کہ بعض حیثیات سے تناسخ کا اعتقاد کم از کم اس سے بہتر ہے کہ موت کو فنائے محض اور عدم مطلق سمجھا جائے۔ کیونکہ انسان میں بقائے دوام کی جو ایک فطری خواہش ہے وہ تناسخ میں ایک حد تک تسکین پا سکتی ہے، اور اس کے ساتھ اس عقیدہ میں جزا و سزا، اور اعمال کے اچھے اور برے انجام کا جو تخیل موجود ہے، اس کی بنا پر یہ ایک اچھے اور مضبوط اخلاقی قانون کے لئے پشت پناہ بھی بن سکتا ہے۔ لیکن اول تو یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، جس کی طرف ہم بار بار اشارہ کر چکے ہیں کہ جو عقیدہ عقل اور علم کے خلاف اور تمدن و تہذیب کی ترقی میں مانع و مزاحم ہو اسکی گرفت انسان کے دل و دماغ پر کبھی ایسی مضبوط نہیں ہو سکتی کہ وہ علمی و عقلی ارتقاء کے ہر مرتبہ اور ترقی تہذیب و تمدن کے ہر مرحلے میں یکساں قوت کے ساتھ قائم رہ سکے۔ اور جب اسکی گرفت قائم ہی نہیں رہ سکتی تو اس عقیدہ کا محض کتابوں میں ایک فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت سے موجود رہنا نظام اخلاق کے بقاء و استحکام کے لئے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ تو اسی صورت میں نافع ہوگا جبکہ وہ کتابوں کے بجائے دلوں میں متمکن ہو، اور لوگ پوری طرح اس پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ دوسرے یہ عقیدہ اپنے آخری نتیجہ کے اعتبار سے اپنی اخلاقی قیمت بھی کھو دیتا ہے۔ کیونکہ جب کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ تناسخ کا چکر بالکل ایک مشین کی طرح چل رہا ہے اور اس میں ہر فعل کا جو نتیجہ مقرر ہے وہ ظاہر ہو کر رہے گا، اور کسی توبہ و استغفار یا کفارے سے اس فعل کی تاثیر اور اس کے نتیجہ کو نہیں بدلا جا سکتا، تو ایک دفعہ گناہ کرنے کے بعد ایسا شخص ہمیشہ کے لئے گناہ کے پھیر میں آجائیگا، اور سمجھ لیگا کہ جب مجھے جانور یا درخت بننا ہی ہے تو کیوں نہ میں اس انسانی جون کی تمام لذتوں سے دل بھر کر فائدہ اٹھالوں۔ (باقی)

کلمۂ جامعہ

یہ ایک مختصر تقریر ہے جو انجمن مجددیہ حیدرآباد کے گذشتہ سالانہ جلسہ میں کی گئی تھی۔ اس وقت جو کچھ ذہن میں تھا عرض کر دیا گیا۔ مگر بعد میں احباب نے خواہش کی کہ اسے قلمبند کر کے شائع کر دیا جائے لہذا حافظہ سے مدد لے کر اس کو پھر صفحہ قرطاس پر منتقل کیا جاتا ہے۔ (ایڈیٹر)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ نبیہ محمد سید المرسلین وخاتم النبیین

برادران ملت:۔

کیا میں آپ کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑھ کر روح کو بالیدگی اور دل کو فرحت بخشنے والا نظارہ کونسا ہے؟ اس نظارہ کو بیان کرنے کے لئے الفاظ سے تصویر کھینچنے کی ضرورت نہیں جس چیز کا آنکھیں یہیں اسی وقت مشاہدہ کر سکتی ہیں اسے بیان کرنے کے لئے زبان کو تکلیف دینے کی کیا حاجت ہے؟ وہ نظارہ یہی ہے جو میں اس وقت دیکھ رہا ہوں اور آپ میں سے ہر شخص دیکھ رہا ہے۔ یعنی مسلمانوں کا اجتماع، مسلمان ہونے کی حیثیت سے، خدا پرست ہونے کی حیثیت سے، امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی حیثیت سے۔ یہ اجتماع صرف میرے اور آپ کے لئے ہی دل خوش کن نہیں ہے۔ اس کو خدا نے بھی پسند کیا ہے اور وہ بھی اس کا عاشق ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۶۱:۴)

اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر جنگ کرتے ہیں کہ گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

یہ محبت صرف اسی صف بندی کے لئے نہیں ہے جو جنگ میں کی جاتی ہے بلکہ اس صف بندی کے لئے بھی ہے جو آپ نماز میں خدا کی عبادت کے لئے کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی لئے آپ کو حکم دیا جاتا ہے اور کیسی تاکید کے ساتھ حکم دیا جاتا ہے کہ۔

اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ (۶۲:۹)

جب جمعہ کے روز نماز کے لئے ندا کی جائے تو خدا کی یاد کے لئے دوڑو اور سب کاروبار چھوڑ دو۔

یہی نہیں بلکہ خدا کی محبت اس پورے اسلامی اجتماع کے ساتھ ہے جو مشرق کے انتہائی کناروں سے لیکر مغرب کے انتہائی کناروں تک پھیلا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اجتماع کو اپنی نعمت قرار دیتا ہے اور احسان جتاتا ہے کہ۔

وَاذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖۤ اِخْوَانًا وَکُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَکُمْ مِّنْھَا (۳:۱۱)

یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو کہ تم آپس میں دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ سے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے پر تھے۔ اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔

حضرات :۔

غور کیجئے کہ وہ کیا چیز ہے جو آپ کو ایک بنیان مرصوص بناتی ہے۔ آپ میں سے ہر شخص اپنا ایک الگ وجود رکھتا ہے۔ ہر شخص کا جسم الگ ہے، جان الگ ہے، حیثیتیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ فراج مختلف ہیں، خیالات مختلف ہیں۔ مگر اس کے باوجود کوئی چیز ہے جو آپ کے درمیان مشترک ہے، اور وہی ایک ایسا رشتہ بن گئی ہے جس نے مختلف دانوں کو جوڑ کر ایک تسبیح بنا دیا ہے، وہی ایک چیز آپ کو مسجد میں کھینچ لاتی ہے۔ اور ایک صف میں محمود و ایاز سب کو کھڑا کر دیتی ہے۔ وہی چیز کبھی آپ کو میدان جنگ میں کھینچ لے جاتی ہے اور ایک مشترک مقصد کے لئے آپ سے سرفروشی کراتی ہے۔ وہی چیز آپ کے درمیان

مناکحت اور مصاہرت کے تعلقات قائم کراتی ہے۔ وہی آپ کو ایک دوسرے کا ہمدرد، رفیق اور غمگسار بنا دیتی ہے۔ اور وہی آپ میں اور دوسری قوموں میں امتیاز کا خط کھینچتی ہے۔ مگر وہ کوئی رسی نہیں ہے جو لکڑیوں کو ایک دوسرے سے باندھ کر جکڑ دیتی ہو، وہ کوئی چونا نہیں ہے جو اینٹوں کو جوڑ کر پیوستہ کر دیتا ہو۔ وہ محض ایک کلمہ ہے جس کو میں کلمۂ جامعہ کے لفظ سے اسی لئے تعبیر کرتا ہوں کہ اس میں انسانوں کو جمع کرنے کی خاصیت ہے۔

کلمہ سے مراد الفاظ نہیں ہیں، بلکہ معانی ہیں۔ اعتقاد اور تخیل کو بھی اس لحاظ سے کلمہ کہتے ہیں کہ وہ الفاظ ہی کا جامہ پہن کر ذہن سے باہر آتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر وہ تخیل کلمۂ جامعہ کہا جا سکتا ہے جو انسانوں کی کسی بڑی تعداد کو جمع کر کے ایک قوم بنا دیتا ہو۔ وہ تخیل بھی کلمۂ جامعہ ہے جس کی بنا پر تمام ترکی النسل قوموں کو ایک قوم بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ تخیل بھی کلمۂ جامعہ ہے جو جرمنی اور آسٹریہ کے اتحاد کی کوششوں میں کام کر رہا ہے۔ وہ تخیل بھی کلمۂ جامعہ ہے جو سلافی نسل کی قوموں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لئے سرگرم کار ہے۔ اور وہ سب تخیلات بھی جامع کلمات ہیں جو ایک زبان بولنے والوں یا ایک نسل کے فرزندوں، یا ایک ملک کے باشندوں کو ایک قوم بناتے ہیں۔ مگر یہ جتنے کلمات ہیں ان سب کی جامعیت محدود ہے۔ کسی کلمہ کی وسعت کو کوئی دریا روک دیتا ہے، کسی کی حد بندیاں پہاڑ اور سمندر کر دیتے ہیں۔ کسی کی وسعت ایک خاص زبان کی وسعت کے ساتھ مقید ہے۔ کسی کا پھیلاؤ بس اسی حد تک ہے جس حد تک کوئی خاص نسل پھیلی ہوئی ہے۔ ایسے کلمات کو ایک ملک کے لئے جامع کہا جا سکتا ہے، ایک نسل کے لئے جامع کہا جا سکتا ہے۔ ایک زبان بولنے والوں کے لئے جامع کہا جا سکتا ہے، مگر تمام دنیا کے لئے جامع نہیں کہا جا سکتا۔

اب دیکھئے کہ کیا وہ کلمہ بھی انہی معنوں میں جامع ہے جس نے آپ کو جمع کیا ہے۔ کیا آپ سب اس لئے جمع ہیں کہ آپ ایک ملک کے رہنے والے ہیں؟ کیا آپ اس لئے بھائی بھائی ہیں کہ آپ سب

ایک ہی زبان بولتے ہیں؟ کیا آپ کو خون کی وحدت نے بنیان مرصوص بنایا ہے؟ کیا آپ اس لئے ایک قوم ہیں کہ آپ کی سیاسی یا معاشی اغراض ایک ہیں؟ آپ یقیناً جواب دیں گے کہ نہیں۔ اگر کوئی عربی بولنے والا عرب اور پشتو بولنے والا افغانی یہاں موجود ہو تو کیا آپ اس کو اپنی جماعت سے نکال دیں گے؟ اگر کوئی حبش کا زنگی یا پولینڈ کا فرنگی یہاں آئے تو کیا اسے آپ اپنی جماعت میں شریک نہ کریں گے؟ آپ اس کا جواب بھی نفی میں دیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کو جمع کرنے والا کلمہ وہ نہیں ہے جس کو پہاڑ اور دریا محدود کر سکتے ہوں، نہ وہ ہے جس کو کوئی نسل محدود کر سکتی ہو۔ نہ وہ ہے جس کو کوئی رنگ محدود کر سکتا ہو۔ نہ وہ ہے جس کو کوئی زبان یا معاشی غرض محدود کر سکتی ہو۔ بلکہ یہ وہ کلمہ ہے جو تمام روئے زمین پر محیط ہے۔ جو ساری نوع انسانی کو اپنی آغوش میں لے سکتا ہے۔ جس کو پھیلنے اور چھا جانے سے دنیا کی کوئی مادی چیز روک نہیں سکتی۔ جس کی بندش میں کالے اور گورے، زرد اور سفید، مغربی اور مشرقی سب یکساں بندھ سکتے ہیں اس کلمہ کو ہم اسی غیر محدود وسعت کے لحاظ سے جامع کہتے ہیں۔ یہ اسی لئے جامع ہے کہ تمام عالم کے انسانوں کو جمع کرنے کی قابلیت اس میں موجود ہے۔

حضرات میں آپ سے پھر ایک گہری نظر کا مطالبہ کروں گا۔ آپ ایک مسلم کی سی بصیرت سے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں اس صفت اور اس خاصیت کا ایک ہی کلمہ ہو سکتا ہے۔ اس بات کو آپ ایک مثال سے آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ دیواریں جو آپ کے سامنے کھڑی ہیں اور یہ ستون جو آپ کے سامنے استادہ ہیں، ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک الگ اور مستقل وجود رکھتا ہے۔ یہ چھت اور یہ فرش بھی بجائے خود الگ الگ ہیں ان میں سے ہر ایک اپنے اندر بہت سے پتھروں اور اینٹوں کو لئے ہوئے ہے ان کے درمیان اختلافات کے سینکڑوں مادے ہیں۔ ان کی وضع مختلف ہے، ان کے مقام مختلف ہیں، ان کی سمتیں مختلف ہیں، ان کے رنگ مختلف ہیں، ان کے وزن اور حجم مختلف ہیں۔ غرض بہت سی چیزیں ہیں جو ان کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ مگر ایک چیز ان میں مشترک ہے، اور وہ

یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی عمارت کے اجزا ہیں، ایک ہی مقصد کی خدمت کے لئے ان کو بنایا گیا ہے۔ اور ایک ہی انجینیر ان کا بنانے والا ہے۔ یہ ایک مادۂ اشتراک تو ان سب کو متحد و متفق کر سکتا ہے۔ باقی جتنے مادے ہیں سب اختلاف کے مادے ہیں نہ کہ اشتراک کے۔ بس اسی طرح دنیا کی مختلف رنگ، مختلف زبانیں، مختلف نسلیں اور مختلف وطن رکھنے والی قومیں اگر مل کر ایک قوم بن سکتی ہیں تو صرف اسی صورت سے کہ وہ سب خداوند تعالیٰ اور اسکے ملائکہ اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور اس کے پاس حاضری کے دن پر ایمان لائیں اس کے سوا اور کوئی چیز ان کو جمع کرنے والی نہیں ہے۔

پھر اسی دیوار کی مثال کو لے کر دیکھئے کہ اس کا رنگ سفید ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی یرقان کا مریض اس کو زرد کہے، ہو سکتا ہے کہ کسی کی آنکھ پر رنگین عینک چڑھی ہوئی ہو اور وہ اسے سرخ یا سبز کہدے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ضد کی وجہ سے اس کو سیاہ یا نیلا کہدے۔ بہرحال اس کے اصلی رنگ کے سوا جتنے رنگ بھی دنیا میں موجود ہیں ان سب کا اطلاق اس پر کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ جتنے اطلاقات ہوں گے سب کے سب جھوٹے ہوں گے، اور کبھی دیکھنے والی دنیا ان مختلف رنگوں کے اطلاق پر جمع نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ دنیا کبھی جھوٹ پر متفق نہیں ہو سکتی۔ اتفاق اگر ممکن ہے تو صداقت ہی پر ممکن ہے۔ اس لئے اگر دیکھنے والے کسی قول پر متفق ہو سکتے ہیں تو وہ یہی ہے کہ اس دیوار کو سفید کہا جائے۔ اسی طرح کائنات کے خالق اور پروردگار کے متعلق بھی بے شمار اقوال ممکن ہیں اور کہے گئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ دو خدا ہیں کوئی تین کہتا ہے، کوئی لاکھوں اور کروڑوں ہستیوں میں خدائی کو تقسیم کر دیتا ہے۔ لیکن سچی بات جس پر آسمان اور زمین کا ہر ذرہ گواہ ہے، وہ یہی ہے کہ خدا ایک ہے۔ اور جیسا کہ ابھی اوپر کی مثال میں آپ نے دیکھا، اگر دنیا کسی کلمہ پر متفق ہو سکتی ہے تو وہ یہی کلمہ ہے۔ اس کے سوا جتنے کلمے ہیں سب جدا کرنے والے اور اختلاف برپا کرنے والے ہیں۔

آگے بڑھئے۔ ملائکہ کے متعلق بہت سے اقوال ممکن ہیں اور سب کہے گئے ہیں۔ کسی نے ان کو دیوتا بنایا

کسی نے انھیں شفیع ٹھیرایا، کسی نے ان کو خدائی میں شریک کیا۔ لیکن سچی بات ایک ہی ہے کہ ملائکہ خدا کے خادم ہیں اور امر الٰہی کے خلاف حرکت کرنے کی قدرت ان میں ذرہ برابر بھی نہیں ہے۔ اگر دنیا میں اتفاق ممکن ہے تو اسی سچی بات پر ممکن ہے باقی سب اختلافات کی بنیادیں ہیں۔

یہی معاملہ انبیاء اور کتابوں کا ہے۔ ہر قوم اپنے اپنے پیشوا اور اپنی اپنی کتاب کو لیکر الگ ہو گئی ہے۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔ ہر قوم کہتی ہے کہ میرا پیشوا سچا اور باقی سب جھوٹے ہر قوم کہتی ہے کہ میری کتاب سچی اور باقی سب کتابیں جھوٹی۔ یہ مختلف اقوال قوموں کو ملانے والے نہیں بلکہ جدا کرنے والے ہیں۔ سب کو ملا کر ایک قوم بنانے والا اگر کوئی قول ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ خدا کے جتنے رسول مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں آئے ہیں سب سچے تھے، جتنی کتابیں خدا کی طرف سے مختلف قوموں کے رسول لے کر آئے سب حق اور نیکی کی تعلیم دینے والی تھیں۔

اسی طرح دنیا کے انجام اور نوع انسانی کے خاتمہ کے متعلق بھی مختلف باتیں کہی جا چکی ہیں اور کہی گئی ہیں لیکن دل جس صداقت پر جھکتا ہے وہ ایک ہی ہے کہ ہم سب کو ایک دن اپنے خالق کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ اور اپنے اعمال کا حساب پیش کرنا ہے۔ اگر دنیا متفق ہو سکتی ہے تو اسی صداقت پر ہو سکتی ہے باقی جتنی باتیں اس کے خلاف ہیں ان میں اختلاف کے سوا کچھ بھی نہیں۔

یہی پانچ چیزیں ہیں جن کے اعتقاد کا نام ہم نے کلمۂ جامعہ رکھا ہے۔

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۔ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ (۲ : ۴۰)

رسول ایمان لایا اس کتاب پر جو اس کی طرف اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے، اور مومن بھی اس پر ایمان لائے۔ سب کے سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے ملائکہ پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، اور کہا کہ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے

اور ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ پروردگار ہم تیری ہی مغفرت کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف واپس جانا ہے۔

ان پانچوں صداقتوں کا ظاہر کرنے والا خدا ہے اور دنیا میں پیش کرنے والا ...... خدا کا رسول ہے اس لئے ان سب کے تفصیلی بیان کو مختصر کر کے ایک چھوٹا سا کلمہ بنا دیا گیا ہے اور وہ کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے۔ خدا کی یکتائی کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کا اقرار یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ ان سب صداقتوں پر ایمان لے آئے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی طرف سے پیش فرمائی ہیں۔

حضرات:۔

یہی وہ قول ہے جس کو بھاری اور ثقیل بات کہا گیا ہے۔ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (۷۳:۵) یہ کسی پتے یا کاغذ کے پرزے کی طرح نہیں ہے کہ معمولی ہوا کے جھونکے اس کو اڑا لے جائیں جس کو ایک جگہ قرار نصیب نہ ہو۔ جو ہر نئے اکتشاف، ہر نئے نظریے، ہر نئے تخیل کے ساتھ لڑھکتا چلا جائے۔ یہ تو پہاڑ کی طرح بھاری بھرکم قول ہے کہ ہواؤں کے طوفان آئیں اور گذر جائیں، پانی کے سیلاب امڈیں اور بیٹھ جائیں مگر یہ اپنی جگہ سے ہلنے والا نہیں یہی بات ہے کہ جس کو دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ:۔

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ تُؤْتِیْ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّھَا وَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ

یعنی کیا نہیں دیکھا تو نے کہ اللہ نے پاکیزہ کلمہ کو کس چیز سے مثال دی ہے۔ وہ ایک اچھی ذات کے درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں زمین میں خوب جمی ہوئی ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت اپنے رب کے اذن سے پھل لاتا ہے۔ اللہ لوگوں کے سامنے

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۚ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ (۱۴: ۴)

یہ مثالیں اس لئے بیان کرتا ہے کہ وہ سبق حاصل کریں اور برے کلمہ کی مثال ایک برے بد اصل درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح ہی پر سے اکھاڑ کر پھینکا جاتا ہے۔ اس کو کوئی قرار اور جماؤ نصیب ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں کو ایک مضبوط قول کے ساتھ دنیا میں بھی ثبات بخشتا ہے اور آخرت میں بھی اور جو ظالم اس قول سے انکار کرتے ہیں ان کو وہ بھٹکا دیتا ہے۔ اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اس تمثیل نے بات کو بالکل واضح کر دیا۔ زمین میں ثبات اور قرار اور پھیلاؤ اسی کلمہ کو نصیب ہو سکتا ہے جو پاک اور سچا اور جامع کلمہ ہے اس کے سوا جتنے کلمے ہیں سب کے سب بد اصل کلمے ہیں کسی کو ثبات و قرار نصیب ہونے والا نہیں ہے۔ وہ خودرو درخت ہیں۔ آج اُگے اور کل اکھڑ گئے۔ زمانہ کا ہر نیا حادثہ، وقت کا ہر نیا تغیر ایک نیا پودا اگاتا ہے اور پچھلے پودوں کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔ ان پودوں میں برگ و بار لانے کی صلاحیت نہیں۔ اور اگر یہ بار لاتے بھی ہیں تو کڑوے کسیلے۔ بلکہ زہریلے دنیا آج انہی پودوں کے خطرناک پھلوں سے مصیبتوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ ان پودوں سے کہیں پروپیگنڈا پیدا ہوتا ہے کہیں ان سے زہریلی گیسیں نکلتی ہیں، کہیں ان سے پھٹنے اور آگ لگانے والے بم جھڑتے ہیں کہیں ان سے نفاق اور عداوت اور حسد و بغض کے بیج نکلتے ہیں جن کی قسمت میں خدا کا عذاب لکھا ہے انہیں چھوڑیے کہ وہ ان پودوں سے دل بہلائیں۔ آپ کے پاس تو وہ پاک اور صحیح الاصل درخت موجود ہے جو ہبوط آدم کے وقت سے آج تک کبھی نہ اکھڑا نہ بے برگ و بار ہوا۔ اس کی جڑیں زمین میں گہری جمی ہوئی ہیں اور اس عالم میں جہاں تک بلندی ہے اس کی شاخیں وہاں تک پھیلتی چلی گئی ہیں۔ اس درخت سے ہمیشہ امن اور سلامتی کا پھل پیدا ہوا ہے۔ یہ آدم کے کسی بیٹے اور بیٹی کو

اپنے سایہ میں پناہ لینے اور اپنے پھلوں کا فائدہ اٹھانے سے نہیں روکتا۔ یہ کسی سے نہیں پوچھتا کہ تو کس نسل سے ہے؟ کیا زبان بولتا ہے؟ کہاں کا باشندہ ہے؟ اس کے سایہ کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس کے نیچے آ گیا وہ انساب کا تفاخر بھول گیا، زبانوں کا فرق، رنگوں کا امتیاز، ملکوں کا اختلاف اس کی نگاہوں میں ہیچ ہو گیا، اور اس کی روح میں یہ تعلیم سما گئی کہ۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا (۴۸: ۲۹)۔

برادران ملت۔

یہ کلمہ اس لئے پیش کیا گیا تھا کہ تمام نوع انسانی ایک بڑی اور عالمگیر صداقت پر متفق ہو سکے اور بے شمار مادی اور عقلی اختلافات کے باوجود ایک امر مشترک ایسا ہو جس میں سب بنی آدم ایک دوسرے کے بھائی بن جائیں۔ اسی لئے ایمان کی بنا ایسے امور پر رکھی گئی تھی جن میں بڑی وسعت تھی اور جو ساری نوع انسانی کو اپنے دامن میں لے سکتے تھے۔ اسی لئے اس کلمہ کو پیش کرنے والے (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا تھا کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ اسی لئے کہا گیا تھا کہ جو اس کلمہ کا قائل ہو جائے اس کا خون حرام ہے، اس کا مال حرام ہے، اس کی عزت حرام ہے۔ وہ تمہارا بھائی ہے۔ اس کو قتل کرنے والا دائمی عذاب جہنم کا سزاوار ہے اور اس کی عزت پر حملہ کرنے والا فاسق ہے لیکن اس سے بڑھ کر بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ ہم نے اس سب سے بڑے جامع کلمے کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ خدا کا فرمان تھا کہ جو خدا، ملائکہ، کتابوں، رسولوں اور یوم آخر کو مانے وہ مسلم ہے۔ مگر ہم نے کچھ دوسری چیزوں پر کفر و اسلام کا مدار رکھا اور ان پانچوں امور پر ایمان لانے والوں میں بھی بے تکلف کفر کی لعنت تقسیم کی۔ اس کلمہ جامعہ کے ہوتے ہوئے بھی ہم اس طرح بکھر گئے کہ گویا ہمارا دین الگ الگ ہے۔ ہم نے عملاً اپنی قومیں الگ بنا لیں، اپنی مسجدیں الگ کر لیں، اپنی نمازیں الگ

کریں اپنے درمیان سے مناکحت اور مصاہرت کے رشتے توڑ دیے اور اس برادری کے تعلق کو قطع کر دیا جو اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کہکر قائم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور مصیبت آئی دوسری قوموں سے ہم نے قومیت کا نیا سبق حاصل کیا جو اسلام کی روح اور اس کی تعلیم کے سراسر منافی تھا۔ جن جاہلی عصبیتوں کا مٹانا اسلامی تعلیم کے اولین مقاصد میں سے تھا وہ سب ہم میں پیدا ہوگئیں۔ کسی نے پین تورانی تحریک کا علم بلند کیا۔ کسی نے پین عرب تحریک اٹھائی کسی نے آریائی نسلیت کا چرچا کیا۔ کسی نے وطنی قومیتوں میں جذب ہوجانے کا اعلان کیا غرض مختلف مذہبی اور سیاسی تحریکوں نے اپنی پوری قوت اسلام کے اس کلمۂ جامعہ کو پارہ پارہ کرنے میں صرف کر دی جو انہی تمام تفریقوں کو مٹا کر نوع انسانی کی ایک عالمگیر برادری قائم کرنے کے لیے پیش کیا گیا تھا۔

میرا یہ مدعا ہرگز نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ اس کلمۂ جامعہ کا مقصد تمام اختلافات کو مٹا دینا تھا۔ اختلاف تو ایک فطری امر ہے جس کا مٹنا ممکن نہیں ہے۔ نہ رنگوں اور نسلوں کا اختلاف مٹ سکتا ہے نہ زبانوں اور ملکوں کا اختلاف نہ خیالات اور طبایع کا اختلاف مٹ سکتا ہے۔ اور جب یہ نہیں مٹ سکتا تو ظاہر ہے کہ کسی نہ کسی طور سے نوع انسانی کے گروہوں میں اعتقاد اور عمل اور اغراض کے لحاظ سے اختلاف ضرور باقی رہے گا لیکن کلمۂ جامعہ کو بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ ان سارے فطری اختلافات کے باقی رہتے ہوئے ایک ایسا عقلی مادہ مہیا کر دیا جائے جس میں تمام ایمان لانے والے مشترک ہو کر آپس میں متحد و متفق ہوجائیں اور اس عقلی اتفاق واتحاد کے اثر سے ان کے وہ اختلافات اس حد تک دب جائیں کہ دلوں کا اختلاف اور اغراض کا تصادم باقی نہ رہے جو فتنہ و فساد کا اصل موجب ہے۔ اسی مقصد کے لیے ایک جامع کلمہ کے ساتھ نماز میں جماعت کی تاکید کی گئی، تمام دنیا کے لیے ایک قبلہ مقرر کیا گیا، روزے اور حج کو اجتماعی صورت دی گئی اور مسلمانوں کے درمیان کھانے پینے میں مناکحت میں اور زندگی کے دوسرے مسائل میں کسی قسم کا امتیاز باقی نہ رکھا گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ دین کا اتحاد تمام چھوٹے اختلافات پر غالب رہے

اور ساری دنیا کے مسلمان مل کر ایک قوم بنے ہیں لیکن آج ہماری مذہبی اور سیاسی فرقہ بندیاں اس قومیت کے رشتہ کو توڑ رہی ہیں، اور اس تعلق کو کاٹ رہی ہیں جو کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ کہنے والوں کے درمیان خود اللہ تعالیٰ نے قائم کیا تھا۔

بھائیو! اگر تمہارے شہر سے متصل کوئی بڑا زبردست بند کسی دریا کے سیلاب کو روکے کھڑا ہو، اور تمہارے شہر کی سلامتی اسی بند کی مضبوطی پر منحصر ہو، اور تم دیکھو کہ اس بند میں شگاف پڑ رہے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ تم اپنی ساری قوتیں ان شگافوں کو بھرنے اور اس بند کی حفاظت کرنے میں صرف کر دو گے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ فتنہ و فساد اور حسد و نفاق اور عداوت و دشمنی کے عظیم الشان اور ہولناک سیلاب کو جو زبردست بند روکے کھڑا ہے، اور جس کی مضبوطی پر سارے دارالاسلام کا بقا و تحفظ منحصر ہے اس میں ہر طرف سے شگاف پر شگاف پڑ رہے ہیں۔ مگر تم کو اس کی کچھ فکر نہیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اس بند عظیم کی حفاظت اتنا مقدس کام ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے شگافوں کو بھرنے کے لئے اپنا سر بھی دیدے، تو اس کام کی نسبت سے یہ کوئی بڑی قربانی نہ ہوگی۔ اس سے بھی بڑی قربانی اگر کوئی ممکن ہوتی تو اس کے لئے وہ بھی کرنی چاہئے تھی۔

کتب سماوی پر ایک نظر

(۵)

عہد جدید۔ (اناجیل وغیرہ)

از جناب ذوقی شاہ صاحب

انجیل مرقس اسکاٹ صاحب اپنی روشن تفسیر صفحہ ۲۳۹ و ۲۴۰ پر لکھتے ہیں کہ :۔

"مرقس کا حال جس نے یہ کتاب لکھی بہت معلوم نہیں ہے۔ اکثر سمجھتے ہیں کہ وہ مسیح کے شتر شاگردوں میں سے تھا لیکن اس میں ایک شبہ یہ ہے کہ پطرس اُسے اپنا بیٹا کہتا ہے۔ (اول پطرس باب ۵ آیہ ۱۳) جس سے گمان پیدا ہوتا ہے کہ وہ پطرس کے وسیلہ سے ایماندار ہوا (یعنی عیسائی ہوا)۔ یہ بھی ٹھیک معلوم نہیں کہ کس وقت یہ صحیفہ لکھا گیا مگر گمان غالب ہے کہ اُس کی تصنیف ۵۶ء اور ۶۳ء کے درمیان میں ہوئی سب متفق طور پر کہتے ہیں کہ شہر روم میں اس کی تصنیف ہوی"

دیگر عیسائی مصنفین کی تحریروں سے بھی یہی پایا جاتا ہے کہ مرقس کو عیسیٰ علیہ السلام کی صحبت نصیب نہ ہوئی تھی بلکہ پطرس کے ہاتھ پر اس نے عیسائیت قبول کی اور جو تعلیم اُس نے پطرس سے حاصل کی اُسے رومی یعنی لاطینی زبان میں لکھکر شہر روم میں اُس نے اپنی انجیل کو تصنیف کیا۔ یہ لاطینی زبان والی اصلی انجیل مرقس گم ہے اور اس کا یونانی ترجمہ موجود ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس لاطینی انجیل کے چند [illegible] کتب خانہ میں موجود ہیں۔ اور وہاں کے لوگ اُن اجزا کو اصلی خیال کرتے ہیں۔

اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ مرقس نے اپنی انجیل لکھکر اپنے اُستاد پطرس کو دکھلائی ہو اور [illegible]

نظر ثانی کی ہو کیونکہ سینٹ ارنیوس سنہ ۱۷۸ء میں لکھتے ہیں کہ "پطرس کے مرید اور مترجم مرقس نے بعد موت پطرس اور پلوس کے وہ چیزیں جو پطرس نے وعظ کی تھیں لکھ کر دیں" پھر یونانی ترجمہ میں غلطیوں کے ہونے کا بھی عیسائی مصنفین کو اعتراف ہے چنانچہ وارڈ صاحب اپنے اغلاط نامہ میں لکھتے ہیں کہ بقول جروم کے علمائے متقدمین کو اس انجیل کے آخری باب کی صحت میں شبہ تھا۔ مرقس باب ۲ آیہ ۲۶ میں جو لفظ ابیاتھر آیا ہے اس کی بابت بھی وارڈ صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۳۶ پر لکھتے ہیں کہ :۔ "مسٹر جویل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ مرقس نے غلطی سے اخیملک کی جگہ ابیاتھر لکھا ہے اور متی نے غلطی سے ذکریاہ کی جگہ یرمیاہ لکھا ہے"۔

اس تصنیف کی تاریخ بھی مشکوک ہے۔ ہارن صاحب اپنی تفسیر کی جلد ۴ حصہ ۲ باب ۲ میں لکھتے ہیں کہ

"انجیلوں کی تالیف کے متعلق جو احوال ہمکو قدیم مؤمنین کلیسا سے ملے ہیں وہ ایسے غیر معین اور ابتر ہیں کہ کسی ایک امر معین کی جانب نہیں پہنچاتے اور پرانے پرانے قدمانے اپنے وقت کی گپوں کو سچ سمجھکر لکھدیا اور ان لوگوں نے جو بعد ان کے ہوئے ادب کر کے ان کے لکھے ہوئے کو قبول کر لیا اور یہ روایتیں جھوٹی سچی ایک لکھنے والے سے دوسرے لکھنے والے تک پہنچیں اور بعد گذرنے مدت دراز کے تنقید ان کی متعذر ہو گئی"

چنانچہ اسی جلد میں ہارن صاحب لکھتے ہیں کہ پہلی انجیل سنہ ۳۷ء یا سنہ ۳۸ء یا سنہ ۴۱ء یا سنہ ۴۳ء یا سنہ ۴۸ء یا سنہ ۶۱ء یا سنہ ۶۲ء یا سنہ ۶۳ء یا سنہ ۶۴ عیسوی میں تالیف ہوئی اور دوسری انجیل سنہ ۵۶ء سے ۶۵ تک کسی سال یا سنہ ۶۳ء میں اور تیسری انجیل سنہ ۵۳ء یا سنہ ۶۳ء یا سنہ ۶۴ء میں اور چوتھی انجیل سنہ ۶۸ء یا سنہ ۶۹ء یا سنہ ۷۰ء یا سنہ ۸۹ء یا سنہ ۹۸ء عیسوی میں۔

مسٹر فلپ یوین اپنی کتاب "دی چرچیز اینڈ ماڈرن تھاٹ" (یعنی کلیسا اور خیالات جدید) کے صفحہ ۹۸ و ۹۹ پر لکھتے ہیں کہ

ڈاکٹر رابن سن کو اقرار ہے کہ اناجیل اربعہ مشکوک ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ دوسری صدی کی یہ روایت کہ انجیل دوم کا مصنف سینٹ مارک (مرقس) ہے معتبر ہے

اور یہ کہ مارک پطرس حواری کا ترجمان تھا اور اپنی انجیل کو حواری مذکور کی روایت سے اس نے روما میں تحریر کیا ہے۔ بہت خوب۔ ہم اس نتیجہ کو تسلیم کرتے ہیں یعنی یوں سمجھو کہ ایک انجیل کی روایت ایسے راوی سے ہے جو چشم دید روایت بیان کرتا ہے لیکن اس راوی کو صرف ایک سال (اور بقول رجعت پسند ناقدین تین سال) صحبت مسیح حاصل ہوئی۔ یہ حواری ناخواندہ تھا تیس یا چالیس سال کے بعد وہ روایت کرتا ہے جس کو دوسرا شخص (مرقس) غیر زبان میں تحریر کرتا ہے، اور پھر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا ترجمہ کہاں تک اصل کے مطابق ہوا ہے۔ علاوہ اس کے ڈاکٹر ابن سن اپنے ابواب "وعظ کبیر اور غیر مرقسی دستاویز" میں مرقس کے انجیل کی اہم فروگذاشتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ × × × × × × یہ اہم فروگذاشتیں کیا ہیں؟ کیا ہم ان کو معمولی سمجھیں؟ ہم کو خود ان کا تھوڑا سا انتخاب کرکے فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس انجیل میں حضرت عیسیٰ کی بطور اعجاز پیدائش کا نہ کچھ ذکر ہے اور نہ آپ کے عہد طفولیت کے حالات جو کہ سابقہ پیشنگوئی کی تصدیق میں ہوں۔ اسیطرح پہاڑی والے مشہور وعظ کا بھی کچھ ذکر نہیں۔ دوبارہ زندہ ہوجانے کا قصہ صرف چند سطروں میں مذکور ہے اور آسمان پر تشریف لیجانا صرف ایک سطر میں۔ بدقسمتی سے یہی وہ سطریں ہیں جو بالاتفاق الحاقی مانی جاتی ہیں کیونکہ انجیل مرقس کا حقیقت میں باب ۱۶ آیتہ ۸ پر خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے نہ حلول نہ بعثت ثانی نہ صعود کسی مسئلہ کا بھی وہاں ذکر نہیں۔ زبانی روایات، گم شدہ دستاویزیں، اور نامعلوم کاتب بس یہی وہ ذریعے رہگئے جن سے ہمکو ان تفصیلی حالات کا علم ہوتا ہے جو ہمارے مذہب کی روح رواں ہیں کیا اس سے بڑھکر اور بھی کوئی ناقابل اطمینان امر ہے جس میں سچی صداقت۔

اور انجیل کی حقانیت پر شبہ عائد ہوتا ہو؟

انجیل لوقا لوقا انطاکیہ کا رہنے والا ایک طبیب تھا اور عیسائی مصنفین کا اتفاق ہے کہ وہ غیر اقوام میں سے تھا۔ اس سے دو کتابیں منسوب ہیں۔ ایک انجیل لوقا دوسری رسولوں کے اعمال۔ بقول مصنف مفتاح الکتاب لوقا نے انجیل ۶۳ء کے قریب اور اعمال ۶۴ء کے قریب لکھی۔

بعض مسیحی علماء کا گمان ہے کہ لوقا عیسیٰ علیہ السلام کے ستر شاگردوں میں سے تھا مگر خود لوقا ہی کی انجیل سے اس گمان کی تردید ہوتی ہے۔ اول تو ان ستر (۷۰) شاگردوں کا ذکر ہی سوا انجیل لوقا کے کسی اور انجیل میں مذکور نہیں نہ ان کے نام کسی کو معلوم ہیں حالانکہ اتنی بڑی بات کا ذکر اور انجیلوں میں بھی ہونا چاہیے تھا جیسا کہ (۱۲) بارہ حواریوں کے احوال سے تمام انجیلیں بھری پڑی ہیں۔ دوسرے یہ کہ لوقا نے خود ہی اپنی انجیل کی تمہید میں لکھا ہے کہ جنہوں نے مسیح کو دیکھا تھا اور مسیح کی خدمت کی تھی اُن سے پوچھکر میں لکھتا ہوں اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ لوقا نے مسیح کو نہیں دیکھا۔ دوسرے یہ کہ اس نے جو کچھ لکھا وہ الہام سے نہیں لکھا بلکہ لوگوں سے پوچھکر لکھا۔

اکثر عیسائی علماء بھی لوقا کو پولوس کا شاگرد اور ترجمان قرار دیتے ہیں اور پولوس کی نسبت یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے مسیح کی صورت بھی دور سے دیکھی ہو چہ جائے کہ مسیح کی خدمت اور شاگردی کی ہو۔ اردو تاریخ کلیسا مطبوعہ ۱۸۷۰ء کے صفحہ ۴۴ پر ہے کہ:-

"جب پلوس شہر تروآس میں گیا جو بحر روم کے ساحل پر واقع ہے تو یہاں اس سے اور لوقا سے ملاقات ہوئی اور اس وقت سے برابر لوقا پلوس کے ساتھ رہا"

پھر اسی صفحہ کے حاشیہ پر مندرجہ ذیل عبارت بھی درج ہے کہ:-

"اس کی عبارت سے ظاہر ہے کیونکہ وہ اس کے بعد اعمال الرسل کے آخر تک صیغہ جمع استعمال میں لاتا ہے۔ لوقا کی انجیل اور اعمال الرسل دونوں اسی کی تصنیف ہیں"

اس سلسلہ میں مغالطہ میں ڈالنے والی ایک اور بات بھی پیدا ہوئی ہے۔ پادری والش صاحب کے زیر اہتمام ۱۸۶۶ء میں مشن پریس آلہ آباد سے ایک کتاب "قربت الٰہی" کے نام سے شائع ہوئی تھی اس کے صفحہ ۹۵ پر واقعات درج ہیں کہ آتش پرستوں کے مذہب کی تائید میں ایک کتاب قسطا کے نام سے موسوم ہے جس کا مصنف بھی ایک ایسا شخص ہے جس کا نام لوقا ہے۔ یہ لوقا بھی غیر یہودی تھا اور طبیب تھا صاحب تصنیف بھی تھا اور شہرۂ آفاق بھی اور اسکا بھی زمانہ عروج مسیح کے بعد تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جسمیں لوگ اپنی طرف سے کتابیں لکھکر مشہور و معروف لوگوں کے نام سے موسوم کر دیا کرتے تھے۔

انجیل لوقا کے باب ۳ میں مسیح کا جو نسب نامہ درج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو انجیل متی میں دیا گیا ہے اور اس میں چند صریح غلطیاں بھی ہیں جن کی تفصیل کو طوالت کے خیال سے سردست نظر انداز کیا جاتا ہے بعض عیسائی علماء نے ان دونوں نسب ناموں میں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے اور بڑی کھینچ تان سے کام لیا ہے مگر جان کالون اپنی تفسیر میں ان تمام بناوٹ کی باتوں کی تردید کرتا ہے۔

انجیل یوحنا بقول بعض عیسائی مصنفین کے یوحنا کی انجیل سب سے زیادہ معتبر ہے اگرچہ زمانہ تصنیف کے لحاظ سے سب سے زیادہ موخر ہے مکاشفات یوحنا اور انجیل یوحنا دونوں ایک ہی مصنف کی تصنیف بیان کی جاتی ہیں۔ مکاشفات کی تاریخ تصنیف مختلف طور پر سنہ ۹۵ء سنہ ۹۶ء اور سنہ ۹۷ء اور انجیل یوحنا کی تاریخ سنہ ۹۰ء سے لیکر سنہ ۱۱۰ء تک بیان کی گئی ہے مگر بعض عیسائی مصنفین ہی نے یہ شبہ بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ دونوں کتابیں اپنے انداز بیان سے ایک مصنف کی لکھی ہوئی نہیں معلوم ہوتیں۔ مکاشفات میں یوحنا نے جابجا اپنی جانب کہیں "میں" کہیں "مجھ یوحنا نے" سے اشارہ کیا ہے لیکن یوحنا کی انجیل میں عبارت کا ڈھنگ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوسکے کہ یہ انجیل یوحنا کی لکھی ہوئی ہے۔ یوحنا باب ۱۹ آیہ ۲۶ میں ہے کہ "یسوع نے اپنی ماں کو اور اُس شاگرد کو جسے وہ پیار کرتا تھا"...۔ اور باب ۲۰ آیہ ۲ میں ہے کہ: "تب وہ شمعون پطرس اور اس دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوع پیار کرتا تھا..." پھر اسی باب کی آیہ ۳ میں

ہے کہ: "پھر پطرس اور وہ دوسرا شاگرد نکلے اور قبر کی طرف گئے" باب ۲۱ کی آیات ۲۰ و ۲۳ میں بھی اسی طرح "اُس شاگرد" اور "وہ شاگرد" کے الفاظ آئے ہیں۔ بعض عیسائی گمان کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا اقتباسات میں "اُس شاگرد" سے یوحنا اپنی جانب اشارہ کرتا ہے مگر ٹامس اسکاٹ اپنی تفسیر کے صفحہ ۲۱ پر اس گمان کو غلط قرار دیتے ہیں۔ اسی شاگرد (بصیغۂ غائب) کے سلسلہ میں ایک اور اقتباس بھی ہے جو اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ انجیل یوحنا کے اختتام پر باب ۲۱ آیہ ۲۴ میں ہے کہ: "یہ وہ شاگرد ہے جس نے ان کاموں کی گواہی دی اور ان باتوں کو لکھا اور ہم کو یقین ہے کہ اُس کی گواہی سچ ہے" ظاہر ہے کہ کوئی مصنف اپنی شان میں اس قسم کا فقرہ نہیں لکھ سکتا۔ پھر یہ بات کہ جس نے اِن کاموں کی گواہی دی اور ان باتوں کو لکھا اُس کی اور اُس کی شہادت کی صداقت کا ہمکو یقین ہے صاف دلالت کرتی ہے کہ کتاب کا لکھنے والا کوئی اور شخص ہے اور اُس کی صداقت پر یقین کرنے والا کوئی دوسرا شخص ہے۔ کاتب بصیغۂ غائب بھی لامعلوم اور کاتب کی صداقت پر گواہی دینے والا بصیغۂ حاضر بھی لامعلوم۔ نہ کاتب سے کوئی واقف نہ یقین کرنے والے گواہ سے کوئی باخبر۔ صرف ظنیات ہیں اور انجیل موجودہ، اور وہ شکوک بلکہ بے اعتقادی، جن سے بعض تعلیمیافتہ اور سمجھدار عیسائی تک محفوظ نہیں۔

برشنیڈر عیسائیوں میں ایک بڑا محقق گذرا ہے۔ اُس کا قول ہے کہ یہ انجیل اور دیگر نامے یوحنا کی تصنیف نہیں بلکہ انہیں کسی عیسائی نے دوسری صدی کے شروع میں یوحنا کے نام سے لکھدیا۔ دوسری صدی عیسوی میں عیسائیوں کا ایک فرقہ الوجین کے نام سے مشہور تھا۔ اس فرقہ کے لوگوں کا بھی اس انجیل کے متعلق یہی عقیدہ تھا۔ اسٹاڈلن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ بلاشک مدرسہ اسکندریہ کے کسی طالب علم نے اس انجیل کو تصنیف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب دوسری صدی میں لوگوں نے اس انجیل سے انکار کیا تو اس کے جواب میں ارنیوس نے کہیں نہیں کہا کہ پولی کارپ سے مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ انجیل یوحنا حواری کی تصنیف ہے حالانکہ ارنیوس شاگرد تھا پولی کارپ کا اور پولی کارپ مرید تھا یوحنا حواری کا

اور ارنیوس نے ذرا اِدھر اسی بات پولی کارپ سے بار بار سنی۔ اگر یہ انجیل یوحنا کی ہوتی تو منکرین کے مقابلہ میں ارنیوس ضرور پولی کارپ کی سند پیش کرتا اور اِس انجیل کی حقانیت کو آشکارا کرتا۔ گروتیس بھی عیسائیوں میں ایک زبردست عالم و محقق گذرا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس انجیل کا اکیسواں باب الحاقی ہے جسے یوحنا کی موت کے بعد افسس کے کلیسا نے اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔

مندرجۂ بالا خیالات وہ ہیں جو عیسائی مصنفین ہی کے قلم سے ظاہر ہوئے ہیں۔ مسلمانوں نے انجیل کا احترام ہمیشہ اہلِ کتاب سے زائد کیا۔ وہ اس ساری انجیل کو از اول تا بہ آخر جعلی اور الحاقی قرار نہیں دیتے بلکہ وہ اس کے بعض مضامین کو قرآن کے مطابق پاتے ہیں اور اُس میں کی بعض پیشینگوئیوں کو سچا سمجھتے ہیں گو ان کے مفہوم میں انھیں عیسائیوں سے اختلاف ہو۔

اعمال مثل انجیل لوقا کے "رسولوں کے اعمال" کو بھی لوقا سے منسوب کیا گیا ہے لیکن اس کتاب میں صرف پطرس اور پولوس کے تاریخی حالات درج ہیں اور ظاہر ہے کہ تاریخی واقعات کی قلمبندی کو الہام سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ جو واقعات کہ قلمبند کئے گئے ہیں وہ صرف ذاتی معلومات کی بنا پر ہیں نہ کہ الہام کے تحت ہیں اور ایسی کتاب کا بائبل میں شامل کیا جانا تعجب انگیز ہے۔ علاوہ ازیں عیسائیوں ہی میں سے فرقہ والن ٹی نینس اور مارسیونی اور سویرینس و نیز چند دیگر فرقوں نے بھی اس کتاب کے معتبر ہونے سے انکار کیا ہے۔

پولوس کے خطوط کتاب اعمال کے بعد مجموعہ کتب عہد جدید میں پولوس کے (۱۴) خطوط درج کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک خط جو عبرانیوں کے نام ہے عام طور پر مشکوک ٹھیر گیا ہے۔ کتاب "سوال و جواب" مترجمہ پادری یونس سنگھ اور پادری والش صاحب میں سوال ۱۵۲ کے جواب میں عبرانیوں کے خط کے متعلق یوں لکھا ہے کہ اس کی بابت لوگوں میں بڑا اختلاف ہے "بہتیرے اسے پلوس سے نسبت دیتے ہیں اور بہت سے عالی سند نکتہ دان اس بات کو اعتماد کے ساتھ رد کرتے ہیں۔ پر اُس کے راقم کا تصفیہ نہیں کر سکتے" پھر

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھا ہے کہ "وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کا طرز پلوس کے طرز کے مانند نہیں اکثر مقاما‌ت میں اس کے طرز سے اختلاف پڑتا ہے۔ جو لوگ کہ یونانی کا بخوبی علم رکھتے ہیں وے کہتے ہیں کہ اس خط کی یونانی پلوس کی یونانی سے مشابہ نہیں ہے" یہ امر بھی غور طلب ہے کہ اس خط میں راقم کے نام کا کہیں ذکر نہیں۔ تاریخ یوسی بیس کی چھٹی کتاب کے باب ۲۵ میں اُرجن کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ: "جو احوال قبل ہمارے زبان زد رہا ہے یہ ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ کلیمنٹ نے جو روم کا بشپ تھا نامہ عبرانیوں کو تصنیف کیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ لوقا کا ترجمہ کیا ہوا ہے" اریبیس بشپ لینس (تخميناً ۲۵۰ء) اور ہپ پولٹس (۲۲۰ء) اور نوکی ٹس پریسبیٹر روم (تخميناً ۲۵۱ء) نے اس نامہ سے بالکل انکار کیا ہے۔ ٹرٹیلین جو ۲۰۰ء کے قریب کارتھیج کا پریسبیٹر تھا عبرانیوں کے نامہ کو نامہ برنباہ بتلاتا ہے کیس جو ۲۱۲ء کے قریب روم کا پریسبیٹر تھا پولوس کے صرف تیرہ (۱۳) نامے گنتا ہے اور نامہ عبرانیوں کو شمار میں نہیں لاتا سائی پرن جو ۲۴۸ء میں کارتھیج کا بشپ گذرا ہے اپنی تحریروں میں اس نامہ کا سرے سے حوالہ ہی نہیں دیتا۔

مندرجہ بالا بحث پولوس کے صرف ایک خط کے متعلق تھی بگران کے تمام خطوط عیسائی مصنفین کے ہی ہاتھوں مجروح ہو چکے ہیں۔ پادری فاکس صاحب اپنی تفسیر اعمال مطبوعہ الہ آباد ۱۸۶۶ء کے مقدمہ کتاب کے صفحہ ۷ پر لکھتے ہیں کہ کتاب اعمال میں باب ۱۳ سے لیکر باب ۲۸ تک پولوس کے تمام واقعات وحالات واعمال کا ذکر ہے بگر پولوس کے ان خطوط کا کہیں ذکر نہیں۔ یوسی بیس اپنی تاریخ کی چھٹی کتاب کے باب ۲۵ میں اُرجن کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ "پولوس نے تمام گرجوں کو کچھ لکھکر نہیں بھیجا بگر بعض کو جو لکھا تو بھی دو چار سطر عبارت"۔ لارڈنر صاحب اپنی تفسیر مطبوعہ ۱۸۲۷ء جلد ۲ صفحہ ۲۰۳ پر ارجن کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ فرقہ ابیونی کے دونوں گروہوں نے پولوس کے نامجات کو رد کیا تھا اور پولوس کو دانا اور نیک آدمی نہیں سمجھتے تھے۔ یوسی بیس بھی اس قول کی تائید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ابیونیوں کے نزدیک پولوس

توریت سے منحرف تھا۔

افسیون کے نام پہلا خط جس کا حوالہ افسیون کے باب ۲ آیہ ۲ و ۴ میں موجود ہے مجموعہ کتب عہد جدید میں شامل نہیں تعجب ہے کہ پولوس کے جو خطوط انجیل میں شامل ہیں اُن کا تو کہیں سے کوئی ثبوت بہم نہیں پہنچتا لیکن جن خطوط کا ثبوت انجیل مروجہ میں ملتا بھی ہے اُن کا کہیں پتا نہیں۔

اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ خطوط پولوس ہی کے لکھے ہوئے ہیں تو ان خطوط کے الہامی ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ اول قرنتیوں کے باب ۷ آیہ ۱۲ میں پولوس لکھتا ہے کہ:۔

"پر باقیوں کو خداوند نہیں میں کہتا ہوں۔۔۔۔"

جس سے صاف ظاہر ہے کہ پولوس اپنی طرف سے لکھ رہا ہے اور جو کچھ لکھ رہا ہے وہ اپنی رائے سے لکھ رہا ہے نہ کہ الہام سے کیونکہ اگر الہام سے لکھتا تو وہ لکھا ہوا خداوند کی طرف سے ہوتا۔ اسی طرح اسی باب کی آیہ ۲۵ میں وہ لکھتا ہے کہ:۔

"پر کنواریوں کے حق میں خداوند کا کوئی حکم مجھ پاس نہیں لیکن جیسا دیانتدار ہونے کے لئے مجھ پر خداوند کی طرف سے رحم ہوا ویسا ہی میں اپنی رائے ظاہر کرتا ہوں۔"

دوم قرنتیوں کے باب ۸ آیہ ۸ میں پولوس لکھتا ہے کہ:۔

"میں کچھ حکم کے طور پر نہیں بلکہ اور دل کی سرگرمی کے سبب اور تمہاری محبت کی حقیقت آزمانے کے لئے یہ کہتا ہوں۔"

اس نوع کی عبارت کو الہام ربانی سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اگر انجیل مروجہ کو خدا کی کتاب یا عیسیٰ مسیح کی کتاب قرار دیا جاتا ہے تو پولوس کی ذاتی تحریروں کی اُس میں شمولیت کیونکر جائز ہو سکتی ہے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ یہ تحریریں بھی ہر اعتبار سے مشکوک ہوں اور پولوس ان بارہ تخت نشینوں میں سے بھی نہ ہو جن کی نشان دہی مسیح نے کی اور جنہیں تخت نشینی کی بشارت دی گئی جیسا کہ متی باب ۱۹ آیہ ۲۸ میں ذکر آیا ہے

یعقوب کا خط فرقہ پراٹسٹنٹ کے پیشوا مارٹن لوتھر نامہ یعقوب کے متعلق یہ رائے رکھتے تھے کہ "یہ گھاس پھوس ہے" یعنی نہایت بے قدر اور ناقابل اعتبار۔ وارڈ صاحب اپنی کتاب "اغلاط نامہ" کے صفحہ ۲۶ پر لکھتے ہیں کہ:۔

"پومرن جو کہ شاگرد رشید لوتھر اور علماء کبار فرقہ پراٹسٹنٹ سے ہے لکھتا ہے کہ یعقوب اپنے نامہ کو واہیات میں تمام کرتا ہے اور حوالہ کتابوں کا ایسا مختلف دیتا ہے کہ جس میں روح القدس نہیں رہ سکتا اس لئے وہ نامہ الہامی کتابوں میں نہ گنا جائے"۔

یعقوب باب ۵ آیہ ۱۴ میں ہے کہ:۔

"اگر کوئی تم میں بیمار پڑے تو کلیسے کے بزرگوں کو پاس بلائے اور وے خداوند کے نام سے اُس پر تیل ڈھال کے اس کے لئے دعا مانگیں"۔

مندرجہ بالا حکم کے متعلق مارٹن لوتھر لکھتے ہیں کہ:۔

"گو یہ نامہ یعقوب کا ہو مگر میں جواب دیتا ہوں کہ حواری کو نہیں پہنچتا کہ اپنی طرف سے سکرمنٹ (یعنی حکم شرعی) بنا دے۔ یہ منصب صرف عیسیٰ (علیہ السلام) کا تھا"۔

یہ وہی یعقوب ہیں جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے پولوس کو خادم دین بنایا اور یہی وہ ترکیبیں ہیں جن سے پولوسیوں کو جرأت ہوئی کہ وہ اپنی رائے سے ترمیم و تنسیخ عمل میں لا کر شریعت کی اصلی صورت کو تبدیل کر ڈالیں۔ اس اجمال کی تفصیل دوسرے موقعہ پر انشاء اللہ آئے گی۔

پطرس کے دو خطوط اس کے بعد پطرس کے دو خطوط مجموعہ میں شامل ہیں۔ پطرس کا شمار عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں ہے مگر تعجب ہے کہ بعض عیسائی مصنفین نے ان پر بھی بہت کچھ لے دے کی ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ عیسائی تحریریں ان کے متعلق کیا کہتی ہیں۔ یہ وہی پطرس ہیں جنھیں مخاطب کر کے مسیح نے

ایک مرتبہ کہا تھا کہ:- "اے کم اعتقاد تو کیوں شک لایا" (متی۔ باب ۱۴۔ آیہ ۳۱) دوسرے موقعہ پر مسیح نے انہیں شیطان کہا متی باب ۱۶ آیہ ۲۳ میں ہے کہ:- "پر اُس نے (یعنی مسیح نے) پھر کے پطرس سے کہا اے شیطان میرے سامنے سے دور ہو تو میرے لئے ٹھوکر کا باعث ہے کیونکہ تو خدائی باتوں کا نہیں بلکہ انسان کی باتوں کا خیال رکھتا ہے"۔ بالآخر جب کہ مسیح کے مصلوب ہونیکا وقت قریب آیا تو مسیح نے پیشین گوئی کی کہ اسی رات مرغ کے بانگ دینے سے پہلے پطرس تین مرتبہ مسیح کا انکار کریگا چنانچہ یہ پیشینگوئی پوری ہوئی (دیکھو متی باب ۲۶۔ آیہ ۳۴ اور آیہ ۶۹ تا ۷۵)۔ مسٹر بولنگ پطرس پر غلطی اور انجیل کے متعلق جہالت کا الزام لگاتے ہیں۔ برنسس جو کہ بقول جویل صاحب کے ایک فاضل اجل عیسائی تھا کہتا ہے کہ حواریوں کے سردار پطرس نے اور برنباہ نے بھی بعد نزول روح القدس کے غلطیاں کیں۔ جان کالوِن کا قول ہے کہ پطرس نے کلیسا میں بدعات پھیلائیں اور عیسائیوں کی آزادی کو خطرہ میں ڈالا اور توفیق طاعت کو ان سے چھین لیا۔ اس بارہ میں وہ پطرس اور برنباہ کو بہت ملامت کرتا ہے۔ وائی تیکر جو فرقہ پراٹسٹنٹ میں ایک زبردست عالم گذرا ہے کہتا ہے کہ:۔ بعد عروج مسیح اور نزول روح القدس کے سارے کلیسہ نے غلطی کی ہے۔ نہ صرف عوام بلکہ خواص نے بھی۔ بلکہ حواریوں نے بھی جو غیر اسرائیلیوں کو ملت مسیحی کی جانب دعوت دی اور پطرس نے اور بھی غلطی رسوم میں کی اور یہ بڑی غلطیاں حواریوں سے بعد نزول روح القدس کے ہوئیں"۔ گلتیوں کے باب ۲ آیہ ۱۱ تا ۱۴ اپولوس کا قول درج ہے کہ:- "پر جب پطرس انطاکیہ میں آیا تو میں نے روبرو اس سے مقابلہ کیا اس لئے کہ وہ ملامت کے لائق تھا کیونکہ وہ پیشتر اس سے کہ کئی شخص یعقوب کی طرف سے آئے غیر قوم والوں کے ساتھ کھایا کرتا تھا پر جب وے آئے تو مختونوں سے ڈر کر پیچھے ہٹا اور الگ ہوگیا۔ اور باقی یہودیوں نے بھی اس کے ساتھ دورنگی کی یہاں تک کہ برنباس بھی دب کر اُن کی ریا میں شریک ہوا"۔ تعجب ہے کہ جس پطرس پر ان غلطیوں اور ریاکاریوں کا الزام لگایا گیا ہے اسی پطرس کے دو خطوط کو الہامی نوشتوں میں شامل کر کے کتب مقدسہ عہد جدید میں جگہ دیجاتی ہے اور ایسی تحریروں کو انجیل مروجہ کے اجزاء ترکیبی کا

مرتبہ دیا جاتا ہے۔

یوحنا کے خطوط و مکاشفات اس کے بعد یوحنا کے تین خطوط مجموعہ میں درج ہیں اور سب سے آخر میں مکاشفات

پہلے خط کی بابتہ مفتاح الکتاب کے صفحہ ۲ پر لکھا ہے کہ :۔ " اگرچہ اس خط کے شروع یا آخر میں یوحنا کا نام نہیں ہے مگر ہر زمانہ کے لوگ اسی رسول کو اس خط کا راقم کہتے آئے ہیں"۔ مگر یہ کچھ نہیں لکھا کہ یہ خیال کن واقعات پر مبنی ہے۔ صرف انداز عبارت اور مضامین خط سے ان امور میں غالط خواہ رہنمائی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے خط کی بابت مفتاح الکتاب میں لکھا ہے کہ :۔ " جس برگزیدہ بی بی کو یہ لکھا گیا وہ بظاہر ایک عزت دار عیسائی بیوہ تھی جو کلیسوں میں مشہور تھی لیکن اس کی تحقیق خبر نہیں کہ وہ کہاں کی رہنے والی تھی۔ شاید اس کا گھر کا شہر افسس کے قرب وجوار میں تھا۔ اگرچہ اس خط میں راقم کا نام نہیں پایا جاتا تو بھی صریح ہے کہ یوحنا ہی نے یہ ۶۹ء کے قریب لکھا"۔ تعجب ہے کہ جس خط میں نہ کاتب کا نام درج ہے، نہ مکتوب الیہا کا نہ تاریخ تصنیف اس خط کی مکتوب الیہا کی سکونت کا مقام اور اس خط کی تصنیف کا سنہ مصنف مفتاح الکتاب کو کس ذریعہ سے معلوم ہوا بالخصوص جبکہ عیسائی مصنفین میں اس بارہ میں اختلاف ہو۔ پادری یونس سنگھ اور پادری واش نے اپنی کتاب سوال وجواب میں سوال ۲۹۱ کے جواب میں یوحنا کے اس دوسرے خط کی بابت لکھا ہے کہ :۔ " بعضے گمان کرتے ہیں کہ یہ برگزیدہ بی بی یروشلم کی کلیسہ کا لقب تھا پر لوگ بالاتفاق اس بات پر قوی نہیں ہیں اور اس کی نسبت عام خیال یہ ہے کہ وہ ایک عورت تھی جو اپنی دینداری کے باعث مشہور تھی"۔

ڈاکٹر ملبن کا قول ہے کہ سُریا کا کلیسہ پطرس کے دوسرے خط اور یوحنا کے دوسرے اور تیسرے خطوط اور یہوداہ کے خطوط اور یوحنا کے مکاشفات کو تسلیم نہ کرتا تھا۔ کونسل لوڈیا ۳۶۴ء نے بھی کتاب مکاشفات کو معتبر نہیں قرار دیا۔ جروم کے عہد میں بھی بعض کلیساؤں نے اس کتاب کو نہیں مانا۔ یوسی بس اپنی تاریخ کی کتاب، باب ۲۵ میں لکھتا ہے کہ بعض نے کتاب شاہدات کو علیحدہ کر دیا ہے اور اس کے رد میں کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ یہ سب کچھ بے معنی ہے اور جہالت کا بہت بڑا حجاب ہے اور یوحنا کی طرف

اس کی نسبت بالکل غلط ہے کیونکہ اس کا مصنف نہ کوئی حواری ہے نہ کوئی پاک شخص ہے۔ نہ کوئی عیسائی ہے بلکہ ایک ملحد سرن تھس ہے جس نے اپنی تصنیف یوحنا کے نام سے غلط موسوم کر دی۔ لارڈ نر اپنی کتاب کی جلد ۴ کے صفحہ ۳۲۳ پر لکھتے ہیں کہ مکاشفات یوحنا پرانے سریانی ترجمہ میں شامل نہیں۔

یہوداہ کا خط مجموعہ کتب عہد جدید میں خطوط یوحنا اور مکاشفات یوحنا کے درمیان یہوداہ کا جو ایک خط درج کر دیا گیا ہے اس سے بکثرت مسیحی علمائے متقدمین کو انکار رہا ہے۔ گروٹیس کا قول اس بارہ میں یہ ہے کہ یہ اس یہوداہ کا خط ہے جو اورین کے عہد میں یروسلم کا پندرہواں اسقف تھا۔ بائبل کے حصہ عہد جدید کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس نوع کی کتابیں زمانہ دراز تک مجموعہ میں شامل نہیں کی گئیں یعنی جب تک کہ ان کتابوں کے معتبر یا نامعتبر ہونے کے متعلق تحقیقات بہ آسانی کی جاسکتی تھی اس وقت تک تو یہ بائبل میں شامل نہ کی گئیں اور کئی سو برس بعد جب اس قسم کی تحقیقات کا زمانہ گذر گیا اور ان کی صحت یا عدم صحت کی کیفیت کا دریافت کرنا ناممکن ہو گیا اس وقت یہ کتابیں یک بیک بائبل میں شامل کر لی گئیں۔

کیا یہ کتابیں الہامی ہیں؟ ریس کی سائیکلوپیڈیا کی جلد ۱۹ میں عیسائی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور صاف طور پر لکھدیا گیا ہے کہ لوگوں نے کتب مقدسہ کے تمام ما الہامی ہونے کی نسبت بہت کچھ گفتگو کی ہے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ ان کتابوں کے مؤلفین کے افعال اور ان کی تحریروں میں غلطیاں بھی ہیں اور اختلافات بھی۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حواری بھی آپس میں ایک دوسرے کو صاحب وحی نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ یروسلم کی کونسل میں آپس کی چھیڑ چھاڑ اور پولوس کے پطرس پر الزامات لگانے سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ پھر اس امر کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ قدیم زمانے کے عیسائیوں کا خیال ان لوگوں کے متعلق یہ تھا کہ یہ لوگ خطا سے خالی نہیں اور بعض صورتوں میں ان کے حرکات و سکنات پر روک ٹوک بھی ہوئی ہے۔ بحث مذکورہ میں ایک فقرہ یہ بھی درج ہے کہ: "ہم نہیں پاتے کہ حواری لوگ ایسے طور پر

گفتگو شروع کرتے ہوں جیسے پیغمبر شروع کرتے تھے کہ وہ خدا کی طرف سے بولتے تھے"۔ اس کے بعد سائیکلوپیڈیا مذکور میں لکھا ہے کہ :۔"میکانس نے اس ہوشیاری اور بیدار مغزی سے جو کہ اس عظیم مقصد کے لئے ضروری تھی طرفین کے دلائل کو تولکر اس مسئلہ کا یہ فیصلہ کیا ہے کہ نامجات کے لئے تو الہام البتہ مفید ہے لیکن تاریخی کتابوں کے لئے جیسے کہ اناجیل اور اعمال ہیں اگر الہام سے بالکل قطع نظر کرلی جائے تو کچھ نقصان نہیں بلکہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ اگر تاریخی معاملات میں حواریوں کی گواہی صرف دیگر انسانوں کی گواہی کی طرح مانی جاوے جیساکہ مسیح نے یوحنا باب ۱۵ آیہ ۲۷ میں کہا ہے"جس آیہ کی جانب یہاں اشارہ کیا گیا ہے وہ اور اس سے اوپر کی آیت یہ ہے :۔

"۲۶۔ پر جب کہ وہ تسلی دینے والا جسے میں تمہارے لئے باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی روح حق جو باپ سے نکلتی ہے آوے تو وہ میرے لئے گواہی دیگا۔

۲۷۔ اور تم بھی گواہی دوگے اور کیونکہ تم شروع سے میرے ساتھ ہو" (یوحنا۔باب ۱۵)

مندرجہ بالا آیہ ۲۶ وہی معرکتہ الآرا آیت ہے جس پر مسلمانوں اور عیسائیوں میں بڑے زور و شور کی بحثیں رہی ہیں۔ مسلمان محققین کا فیصلہ ہے کہ اس آیت میں"تسلی دینے والا"غلط ترجمہ ہے یا تو ترجمہ میں غلطی کی گئی ہے یا دیدہ و دانستہ یہاں تحریف سے کام لیا گیا ہے۔ اصل لفظ فارقلیت ہے جس کا صحیح ترجمہ"ستودہ صفات" یعنے احمد و محمدؐ ہے اور یہ پیشنگوئی نبی آخرالزمان کی شان میں کی گئی ہے۔ مگر اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو انشاء اللہ الحاق و تحریف کی بحث میں آئے گی۔

بعد کی آیت یعنی مندرجہ بالا آیہ ۲۷ کے سلسلہ میں اس امر کی جانب اشارہ کر دینا یہاں نامناسب نہ ہوگا کہ بعض معقول پسند اور سمجھدار عیسائیوں کے نزدیک بھی اناجیل مروجہ حواریوں یا حواریوں کے شاگردوں کی لکھی ہوئی صرف تاریخی کتابیں ہیں۔ اور اس سے زیادہ وقعت کی وہ مستحق نہیں"۔ اور مسلمانوں کا اس بارہ میں کہنا یہ ہے کہ ہمارے عقیدہ کے مطابق قرآن عظیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو وحی کے ذریعہ سے رسول مقبولؐ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور ہم تک بلا کسی تغیر و تبدل اور بلا کسی کمی و بیشی کے پہنچا لیکن موجودہ انجیل اس قسم کا کلام نہیں یہ انجیل نہ وہ کلام الٰہی ہے جو عیسیٰ علیہ السلام پر حق تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہو اور ہم تک بلا تغیر و تبدل اپنی اصلی صورت میں پہنچا ہو۔ نہ یہ عیسیٰ علیہ السلام کی تصنیف ہے، نہ آپ کی دیکھی ہوئی اور تصدیق کی ہوئی کوئی کتاب ہے۔ بلکہ یہ محض حواریوں اور ان کے شاگردوں کے ملفوظات ہیں اور وہ بھی بگڑی ہوئی اور مسخ شدہ صورتوں میں۔ ان حالات میں انجیل مروجہ کا قرآن پاک سے کوئی مقابلہ نہیں کیونکہ احادیث کی صحت کا جو اہتمام مسلمانوں نے آج تک رکھا ہے اور احادیث کی صحت و عدم صحت اور صحت کے مختلف مدارج کے تعین میں جو کوشش بلیغ انہوں نے کی ہے اور اصول روایت و درایت کی تدوین میں جس کمال کا ان سے اظہار ہوا ہے اس کی نظیر دنیا کی کسی دوسرے قوم نے آج تک پیش نہیں کی۔ ہاں اس انجیل کا موازنہ بزرگوں کے ملفوظات سے ہو سکتا ہے مگر اس موازنہ کے بعد بھی مشکل ہے کہ عہد جدید کی کتابوں کا پلہ بھاری نکلے۔ اس مسئلہ پر بھی تفصیلی بحث کا موقع اسی سلسلہ مضامین میں آگے چل کر آئے گا۔

باقی۔

مسلم ریویو

"تعلیمات قرآن" پر ایک نظر

(از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز، ہوم ڈیپارٹمنٹ شملہ)

"اسلام دین فطرت ہے" (۳۰:۳۰)

یہ قرآن کا دعویٰ اور ہمارا ایمان ہے۔ تفصیل اس اجمال کی خواہ کسی قدر طول طویل کیوں نہ ہو، مفہوم اس کا یہی ہے کہ اسلام کی تعلیم اس قدر سادہ اور سیدھی دل میں اتر جانے والی ہے، اس کے اصول قوانین فطرت کی طرح، ایسی محکم اور غیر متبدل بنیادوں پر قائم کئے گئے ہیں کہ اس کو قبول کرنے میں ذہن کو، اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے قلوب وجوارح کو، انسانی فطرت کے خلاف جنگ نہیں کرنی پڑتی، نہیں! بلکہ یہ عین فطرت ہے اور اقتضائے فطرت کی طرح تمام نوع انسانی اسے قبول کرنے کے لئے مجبور ومجبول ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جس تعلیم کو عام طور پر آج اسلام کے نام سے پکارا جاتا ہے وہ ایسے لاینحل مباحث اور پیچیدہ مسائل کا مجموعہ بن کے رہ گئی ہے کہ بلا کاہش وتردد قبول کرنا تو ایک طرف انسان کی کاوشیں ہزار سلجھانے کی کوشش کریں، اس کی الجھنیں پیچیدہ تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ دین فطرت کی حقیقی روح تو ہمیں قرن اول میں نظر آتی ہے جبکہ اس سیدھی سادی لیکن واضح تر اور مکمل تر تعلیم نے چند سال کے عرصہ میں ایک اونٹ چرانے والی قوم کو ایک طرف اگر قیصر وکسریٰ کی سلطنتوں کا مالک بنا دیا، تو دوسری طرف اخلاق حسنہ کے اس بلند ترین معیار پر پہنچا دیا کہ دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ ہوتا کیا تھا؟ چند اصول تھے جن پر غائبانہ ایمان، غیر متزلزل ایمان، اور بلا شائبہ تشکیک ایمان ہوتا تھا۔ اس کے بعد عمل کی یہ کیفیت کہ قرآن میں حکم آیا، رسولؐ نے اس کی عملی شکل معین کر دی اور انہوں نے کر کے دکھا دیا۔ وَ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔۔

لیکن یہ دور عمل، یہ سیدھا سادھا سپاہیانہ عہد جلد گزر گیا، خلافت ملوکیت سے بدل گئی اور

اس کے ساتھ ہی عجمی تکلفات اسلامی عنصر میں سرایت کر گئے۔ فرصت کا زمانہ۔ فراغت کے دن۔ ماہرین علوم وفنون کو باریکیاں تلاش کرنے کی مہلت مل گئی۔ ادہر عجمی معاندین خوب سمجھ چکے تھے کہ اسلام کی علمی اور کیرکٹری قوت کے مقابلہ میں وہ کبھی نبرد آزما نہیں ہوسکتے۔ انہوں نے موقعہ غنیمت جانا بحث وتمحیص اور مناظرہ ومجادلہ کے میدان میں آن اترے۔ پہلے یہ حالت تھی کہ ادہر قال اللہ تعالیٰ کی آواز کان میں آئی۔ اور ادہر وہ قال حال کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ اب انہوں نے ان کو اس لفظی بحث میں الجھا دیا کہ جب اللہ کے ساتھ قال کا لفظ لئے تو اس قال کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ چنانچہ ماہیت خدا، کیفیت نبوت، حقیقت ملائکہ، اصلیت مبداء ومعاد کی بحثیں شروع ہوگئیں۔ بحث کا مدار ہمیشہ منطق وفلسفہ پر ہوتا ہے۔ یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا۔ اناجیل کے ابواب کی تشریحات ہوئیں۔ اسرائیلیات کے اضافے عبرانی سے منتقل کئے گئے۔ اگر یہ تمام علمی کوششیں اپنی اپنی جگہ پر رہتیں تو لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کی موجب ہوتیں لیکن مصیبت یہ آن پڑی کہ ایک طرف تو قرآنی حقائق کی کھینچ تان شروع ہوگئی کہ کسی طرح اسے یونانی فلسفہ کے مطابق ثابت کر دیا جائے[1]۔ دوسری طرف قصص قرآنی، کہ جن کے صرف ضروری اور متعلقہ حصص خدائے حکیم وعلیم نے اپنی حکمت بالغہ کے ماتحت قرآن میں بیان فرمائے تھے، اسرائیلیات کی مدد سے مربوط ہونے شروع ہوگئے۔ نتیجہ یہ کہ ایک طرف تو قوائے عملیہ زنگ آلود ہوگئے اور دوسری طرف اسلام کی سیدھی سادھی اور فطرتی تعلیم، اصول فلسفہ کی موشگافیوں اور قصص وحکایات کی توہم پرستیوں کی نذر ہوگئی۔

متکلمین کی نکتہ آفرینیوں سے کچھ سکون ہوا تو قرآن سے شاعری شروع ہوگئی۔ اس میں کلام نہیں کہ قرآن نے اپنے آپ کو جو بے مثل وبے نظیر کہا تو اس کا مقصد الشان ہونا صوری ومعنوی ہر دو لحاظ سے تھا لیکن لفظی اعجاز، ایک ثانوی چیز تھا جو اللہ تعالیٰ نے جہاں توریت وقرآن کی تحدی کی ہے۔ وہاں واضح کر دیا ہے کہ اس سے اصل مقصود کیا ہے

[1] بعینہ اسی طرح آج سب سے بڑی اسلامی خدمت اس کو سمجھا جاتا ہے کہ قرآن کو مفکرین یورپ کا ہم نوا ثابت کر دیا جائے۔ حالانکہ خود ان کے نظریوں کی بھی یہ حالت ہے کہ ایک کے جھٹلانے کے لئے دو دو موجود ہوتے ہیں۔ قرآنی یقین کے مقابلہ میں انسانی نظریات بہر حال ظنی ہیں۔ وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔ (۵۳ - ۲۸) ان کو اس کے متعلق کچھ علم تو ہے نہیں محض گمان کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ گمان حق کے بالمقابل کچھ کارآمد نہیں ہوتا۔ پرویز۔

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲۸-۵) ان سے کہدیجئے کہ اگر تم سچے ہو (اور یہ کتاب جھوٹی ہے) تو تم خدا کے پاس سے کوئی اور کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے ہدایت میں بہتر ہو۔ پھر میں بھی اس کی پیروی کرنے کو تیار ہوں۔

لیکن وہ ظاہری محاسن کے استیعاب میں اس اہتمام و انصرام سے منہمک ہوگئے کہ اس کی باطنی حقانیت نظر انداز ہو گئی۔ لغت۔ صرف و نحو علم الانشاء، علم المعانی، علم البیان، علم البدیع۔ وغیرہ مرتب و مدون ہوئے اور پھر ان کے معیار پر قرآن کو جانچ کر ادب و شاعری کی انسانی تصانیف پر اس کو فوقیت دینے کی کوششوں میں تمام ذہنی قوت صرف کر دی گئی۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ جس عہد سعادت مہد میں قرآن نے وہ نتائج پیدا کئے تھے جن کو دیکھکر آج تک دنیا کے مفکرین انگشت بدنداں ہیں، اس عہد میں ان علوم کا کہیں نشان تک نہ تھا۔[۱] ان کی نگاہ پوست اور غلاف پر نہ تھی بلکہ عروس حقیقت ان کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو چکی تھی لیکن اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد یہ نہیں کہ حضرات متقدمین (علیہم الرحمۃ) کی ان علمی خدمات کی کسی طرح تنکیر و تحقیر کی جائے۔ ہم متاخرین پر ان کے جو علمی احسانات ہیں ان سے انکار کرنا حقیقت پوشی اور قدر ناشناسی ہے لیکن ہر علمی دور کا ایک مخصوص رجحان ہوتا ہے۔ اس وقت اسی چیز کو اہم سمجھا گیا ہوگا اور تشریح مسائل اور تدوین علوم متعلقہ قرآن کے اسی شعبہ دراسی نہج کو انفع و انسب خیال کیا گیا ہوگا لیکن جس چیز نے مشکل پیدا کر دی وہ یہ تھی کہ انکی یہ علمی تحقیقات تحقیق و تفتیش کے حدود سے آگے بڑھ کر "عین دین" قرار پا گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انکے بعد مزید تدبر و تفکر فی القرآن کا گویا دروازہ بند ہو گیا۔[۲]

---

[۱] علم المعانی والبیان پر غالباً عبد القاہر جرجانی (المتوفی سنہ ۴۷۱ھ) نے سب سے پہلی کتاب لکھی۔ لغت کی ابتدا خلیل بن احمد (المتوفی سنہ ۱۷۰ھ) نے کی۔ علم بدیع کا موجد ابن المعتز (المتوفی سنہ ۲۹۶ھ) ہے۔ علم نحو کی ابتدا اگرچہ ابو الاسود الدؤلی (المتوفی سنہ ۶۹ھ) سے ہوئی لیکن ان نے اس موضوع پر صرف چند مبادیات لکھے لیکن سیبویہ (المتوفی سنہ ۱۸۳ھ) اور خلیل ابن احمد (المتوفی سنہ ۱۷۰ھ) نے اس فن کو مستقل کیا۔ "پرویز"۔

[۲] قرآن کریم نے اہل کتاب کے متعلق کہا ہے کہ جب نبی کریم ان کے پاس آئے تو باوجودیکہ آپ ان (کتابوں) کی تصدیق کر رہے تھے مگر نَبَذَ فَرِيقٌ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۲-۱۰۱) ترجمہ: ان اہل کتاب میں سے ایک فریق نے خود کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا جیسے کہ ان کو کچھ علم ہی نہیں۔
بعینہ یہی حالت آج ہماری ہے۔ قرآن ایک نور تھا جو ہمیں اس لئے دیا گیا تھا کہ اس سے ہدایت کا راستہ دیکھتے چلیں لیکن ہم نے اس نور کی شمع ہدایت کو مقلد کے پیچھے رکھ دیا۔ جس سے ہمارا ماضی تو ضرور درخشندہ ہو گیا لیکن مستقبل کو ہم نے خود اپنے ہی سایہ سے تاریک کر لیا۔ اور روشنی ہوتے ہوئے بھی ہم اندھیرے میں رہے۔ "پرویز"۔

ان کی تحقیقات کے نتائج ایسے ہی غیر متبدل اور ناقابل ترمیم گردانے گئے جس طرح خود قرآن۔ تفاسیر لکھی گئیں تو انہی طریقوں پر اور مسائل مستنبط ہوئے تو اسی نہج پر۔ ان کے بعد جو بھی صاحب علم پیدا ہوا اس نے متقدمین کی علمی تحقیقات سے ایک قدم بھی ادھر ادھر ہٹانا گویا خود قرآن سے انحراف سمجھا۔ اس لئے انہی بنیادوں پر ردّے پر ردّا چڑھتا چلا گیا۔ اور دین کی ایک ایسی مستحکم عمارت قائم ہو گئی۔ جس کی بنیادیں ذہن انسانی کی معین کردہ تھیں پچھلے وقتوں تک تو خیر یہ چیز بنیتی چلی گئی۔ کیونکہ ایمان بالغیب کے لئے دلوں میں ابھی تڑپ باقی تھی۔ لیکن جس شخص کو آج کسی "نا قد ذہن" سے واسطہ پڑتا ہے وہ اس مشکل کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے جو اسے ایسے شخص کے سامنے اسلام پیش کرنے میں پیش آتی ہے۔ آج دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی۔ خود قرآن میں تو یہ بات موجود ہے کہ دنیا خواہ اپنی موجودہ سطح سے لاکھ گنا بھی کہیں اور بلندیوں پر چلی جائے تو قرآن اس سے بھی کروڑ گنا اور بلند ہوگا لیکن ذہن انسانی کی پرواز جو آج سے ہزار سال قبل ایک سطح معین کر چکی تھی، وہ تو بہر حال آج سے پیچھے ہی ہوگی۔ لہذا آج فطرت انسانی کو کس طرح سے مجبور کیا جائے کہ وہ اس سطح کو بھی انتہائی بلندیوں کا نشیمن سمجھ کر مطمئن ہو جائے نتیجہ اس جبر و اکراہ کا یہ ہوتا ہے کہ کہیں تو کوہ آتش فشاں کی طرح علانیہ مذہب سے تبرّا و بیزاری برتی جاتی ہے۔ ورکہیں آتش خاموش کی طرح ارتیابی کیفیت اپنی سوزش نہاں سے حسن ایمان و ایقان کو خاک کا ڈھیر بنا تی جاتی ہے۔ لہذا اگر قرآنی حقایق اور اسلام کی تعلیم فطرت پر سے اکتسابی غلاف اتار کر اس کی اصلیت کو بے نقاب کرنے کا وقت کبھی آیا ہے تو وہ آج ہے۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے۔

ضرورت ہے کہ اسلام کو قرآن اور قرآن کی تفسیر ناطق یعنے اسوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں نمایاں کیا جائے۔ اور انسانوں کے مرتب کردہ قواعد وضوابط کو اگر دیکھا بھی جائے تو مشورۃً نہ کہ انہی کو عین دین قرار دے لیا جائے۔

لیکن اس ضرورت کا احساس ہوا بھی تو بدقسمتی سے مسلمانوں کے اور دیگر مسائل کی طرح افراط و تفریط کی رو میں تدبر فی القرآن کے لئے مصنوعی غلافوں کو اس زور سے اتار کر پھینکا گیا کہ ساتھ ہی اس معلم الکتاب والحکمۃ کی ردائے مبارک بھی الجھ کر اتر گئی جس کو خود خدا نے قرآن سمجھانے ہی کے لئے بھیجا تھا جس کا کتاب اللہ کا یہ غلط مفہوم سمجھا گیا کہ قرآن پر عمل پیرا ہونے کے لئے اسوہ رسول اللہ کی بھی ضرورت نہیں۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے تو خیر مسلمان اگر امام الامم نہیں بنے تھے تو مومنین کی صف میں تو تھے۔ مگر اب رسول کی اطاعت سے انکار کر کے ان صفوں سے بھی بیک بینی و دوگوش نکالے گئے۔ اور اصلاح و تجدد کے اس تشدد نے انہیں دین و دنیا میں کہیں کا بھی نہ رکھا۔ قرآن کو حشو و زوائد سے پاک کرتے کرتے اس کی اصل پر ہی تبرآزمائی شروع ہو گئی۔

افراط و تفریط کے اس مد و جزر سے مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ان کی تازہ تالیف "تعلیمات قرآن" کی شکل میں برآمد ہوا۔ بدقسمتی سے مولانائے ممدوح کے متعلق اس سے پہلے کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو چکی تھیں، اور انھیں بھی عام طور پر منکرین حدیث کے زمرہ میں شمار کیا جا رہا تھا۔ اس لئے جب کتاب میرے سامنے آئی تو سب سے پہلے میں نے باب رسالت اور اس میں سے بھی بالتخصیص اطاعت رسول کے عنوان کو دیکھا۔ کیونکہ یہی وہ مقام ہے، جہاں منصب رسالت کے عدم فہم سے ایک اصولی فرق پڑتا ہے۔ سب سے پہلے جو فقرہ مجھے کھٹکا وہ یہ تھا۔

رسول کا فریضہ صرف پیغام الٰہی پہنچانا ہے اور بس (۱۲۸)

میں نے سمجھا کہ یہ وہی استدلال ہے جو تبیین احکام کے خلاف "اہل قرآن" لایا کرتے ہیں لیکن انہوں نے حاشیہ کی تشریح میں اسے خود ہی صاف کر دیا ہے۔ کہ

رسولوں کا کام صرف دین کا پہنچانا ہے۔ دین کا بنانا نہیں" (۱۱)

یہی شبہ پھر ص ۱۵۵ پر "اطاعت رسول" کے عنوان کے تحت جا کر پڑتا ہے جہاں پھر یہ مذکور ہے کہ

بحیثیت منصب رسالت رسول کا فریضہ صرف پیغام الٰہی کی تبلیغ ہے اور بس

لیکن اس شبہ کا ازالہ بھی دو چار سطریں آگے بڑھ کر ہو جاتا ہے جہاں لکھا ہے کہ۔

"ہمارے رسول صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مبلغ تھے"

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْۢ بَلَغَ۔ (۶: ۲) میرے اوپر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ اس سے تم کو بھی آگاہ کر دوں۔ اور ان لوگوں کو بھی جن کو وہ پہنچے۔

اس تبلیغ کی تشریح ان الفاظ میں ہوتی ہے۔

تلاوت و تبیین آیات تعلیم کتاب و حکمت و تزکیہ نفوس سب اسی تبلیغ کے اجزا ہیں۔ (ص ۱۵۶)

نیز: "تعلیم کتاب کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ رسول اس کے احکام پر عمل کر کے دکھا دے تا کہ امت اسی نمونہ پر عمل پیرا ہو جائے"۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (۳۳:۲۱) تمہارے لئے رسول کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

چنانچہ اس کو وہ عمل متواتر کہتے ہیں۔ جس کی مخالفت بقول ان کے خود قرآن کی مخالفت ہے۔

اس کے بعد اطاعت رسول میں دوسری گھاٹی آتی ہے۔ جہاں منکرین حدیث رسول کی اطاعت بحیثیت امیر ہی فرض سمجھتے ہیں اور بس۔ اس کے متعلق مولنا تحریر فرماتے ہیں:۔

"بحیثیت رسول آپ کی اطاعت قیامت تک فرض ہے کیونکہ قرآن ہمیشہ کے لئے ہے لیکن بحیثیت امیر آپ کی اطاعت بالمشافہ تھی" ص ۱۵۷۔

اور:۔

"بحیثیت رسالت آپ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضہ تبلیغ اللہ کی طرف سے آپ کے ذمہ لازم کیا گیا تھا"۔ (۱۱)

ان تصریحات اور مولنا صاحب کے اس بیان کی روشنی میں جو انہوں نے اپنے مسلک کے متعلق معارف بابتہ ماہ مئی میں شائع کیا ہے کم از کم میں تو اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ اگر متشدد فی الحدیث نہیں تو

منکر حدیث بھی نہیں ہیں۔ اور ان کا یہ فقرہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ۔

"جس بات کے متعلق تحقیق ہو جائے کہ رسولؐ نے فرمائی ہے۔ اس کے متعلق کوئی بحث باقی نہیں رہتی۔ اس کے بعد ان سے اگر کچھ اختلاف ہو سکتا ہے تو فن روایت و درایت کی شرائط کے متعلق ہی ہو سکتا ہے نہ کہ قال الرسول کی حجیت اور عدم حجیت پر۔

منصب رسالت کے متعلق ان کا مسلک دیکھ لینے کے بعد اب ہم اصل کتاب کے باقی حصص کو دیکھتے ہیں۔ اس کتاب کی غرض و غایت کے متعلق وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"ایک عرصہ سے میرا خیال تھا کہ قرآن کی تعلیمات کو اس طرح مسلمانوں کے سامنے پیش کروں کہ آسانی سے سمجھ لیں۔ (دیباچہ ص)۔

اس خیال کے مبارک ہونے میں کیسے کلام ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے:-

"جس طرح بھی ہو سکا اس سال میں نے تعلیمات قرآن کا یہ ایک حصہ مرتب کیا ہے۔ اس میں قرآنی آیات چن کر ترتیب کے ساتھ فراہم کی گئی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مسلمان جو اب تک قرآن کو تفسیروں اور ترجموں سے سمجھنے کے عادی ہیں، اس کتاب سے خود قرآنی آیات سے اس کو زیادہ فصاحت اور آسانی کے ساتھ سمجھ سکیں گے" (ص)

متقدمین رح کی تفاسیر کے اس زمانہ کے لئے ناکافی ہونے پر اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے۔ باقی رہا ترجمہ۔ سو اگر کسی لفظ قرآنی کا مفہوم خود قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح طور پر معلوم ہو سکے تو لغت کی بجائے یہ زیادہ نافع ہوتا ہے۔ کیونکہ لغت کی مدوین پر اس زمانہ کے ماحول اور لٹریچر کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے جس میں لغت مدون کی گئی ہو۔

کتاب میں اجزا ایمان (خدا۔ ملائکہ۔ رسالت۔ کتاب اور معاد) کے علاوہ نفس دین اور

(یعنی تخلیق انسانی اور انسانی معاشرت کے مہمات اصول) کے متعلق قرآنی آیات مختلف عنوانات کے تحت جمع کی گئی ہیں۔ "ہر ایک عنوان پر اختصار کی غرض سے کم آیتیں لکھی گئی ہیں۔ اور استیعاب کی کوشش نہیں کی گئی" (صٹ)۔ اگرچہ استیعاب نہ ہونے کی صورت میں بالعموم یہ اعتراض پیدا ہوجاتا ہے کہ مولف نے اپنا نقطۂ نگاہ ثابت کرنے کے لئے انہی آیات کو چنا ہے جو اس کے خیال کی موید ہیں لیکن کتاب پر ایک عمومی نظر ڈالنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ مولف نے اختصار اس غرض کو مدنظر رکھکر نہیں کیا بلکہ محض اختصار کی غرض سے ہی کیا ہے۔ یہ بات اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ پچھلے دنوں ان کے بعض خیالات کی تردید میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں، ان میں جو آیات قرآنی ان کے خیالات کی تردید میں پیش کی گئی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر خود انہوں نے اس کتاب میں جمع کر رکھی ہیں۔ البتہ انکا مفہوم معترضین سے جداگانہ لیا ہے۔ اگر اختصار کا مقصد یہی ہوتا کہ تردید سے بچ سکیں تو ان آیات کو وہ آسانی سے چھوڑ سکتے تھے، لہذا اس باب میں ان کی نیت کے متعلق شبہ کرنے کے لئے کافی وجوہ موجود نہیں ہیں۔

کتاب کی بنیاد کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں کہ

"میں نے اس کتاب کے متن کی بنیاد قرآن کی نصوص صریحہ پر رکھی ہے تاکہ انکار یا بحث کی گنجائش نہ نکل سکے" (صٹ)

اسوۂ رسول اللہ کے متعلق ان کا مسلک (جو اوپر مذکور ہے) پیش نظر رکھنے کے بعد یہ خیال بھی نہایت مستحسن ہے۔ متن کے بعد جو کچھ انہوں نے اپنی طرف سے تشریح کی ہے۔ وہ حواشی میں درج ہے اور ان کے متعلق بھی انہوں نے خود ہی واضح کر دیا ہے کہ

"میں اپنی باتوں کو اتنی وقعت بھی نہیں دیتا کہ کوئی صاحب ان پر اعتراض کی زحمت گوارا کریں میرا مقصود صرف یہ ہے کہ قرآن کو قرآن ہی سے سمجھیں" (صٹ)

جہاں تک اجزاء ایمان کا تعلق ہے، کتاب میں کوئی بحث محل نظر معلوم نہیں ہوتی۔ البتہ ان اصول سے

جو مسائل متفرع ہوتے ہیں۔ ان میں دو چار مقام ایسے ہیں جہاں مروجہ عقاید سے اختلاف کیا گیا ہے۔ مثلاً وہ نفس معجزہ کا وقوع ازروئے قرآن ثابت سمجھتے ہیں لیکن نبی کریمؐ کے لئے حسّی معجزات کا ثبوت قرآن سے نہیں پاتے۔ اسی طرح وہ قیامت کی جزئیات تک کے قائل ہیں جن کی تفصیل قرآن میں مذکور ہے لیکن موت و قیامت میں فصل زمانی نہیں مانتے لہٰذا عذابِ برزخ ان کے نزدیک قرآن سے ثابت نہیں۔ اسی طرح وہ تقدیر کو اجزاء ایمان میں سے نہیں مانتے بلکہ قرآنی مسائل میں سے ایک مسئلہ قرار دیتے ہیں۔

دین میں تفرقہ اندازی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"علماء میں اختلافات پڑتے ہیں۔ اور ہر ایک کی پیرو ایک ایک جماعت ہو جاتی ہے جو اس کو اپنا امام مان کر اس کے اقوال کو اسی طرح بلا سند تسلیم کرنے لگتی ہے جس طرح اللہ کے قول کو۔ اس لئے ہر فرقہ کا مرکز الگ الگ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کے اختلافات کا مٹنا محال ہو جاتا ہے۔ اب تا وقتیکہ وہ اشخاص پرستی کو چھوڑ کر کتاب اللہ کی طرف نہ رجوع کریں اور سب کے سب اس ایک مرکز پر نہ آجائیں، اس وقت تک متحد نہیں ہو سکتے"۔ (۴۷)

اس میں شبہ نہیں کہ دین میں تفرقہ اندازی جرم عظیم ہے۔ اور کسی امام کے قول کو اللہ کے قول کی طرح بلا سند تسلیم کرنا بھی کبھی جائز نہیں رکھا جا سکتا لیکن سوسائٹی کے استبقار و اصلاح کے لئے کسی ایک شرح قانون کی تو لامحالہ ضرورت ہے۔ اس لئے اگر قانون کے لئے کسی امام فن کے مدون کردہ ضابطہ کی طرف رجوع کر لیا جائے تو امید ہے کہ مولٰنا ممدوح اسے اُس تفرقہ اندازی سے منسوب نہ کرتے ہوں گے جس کی بنا پر شرک لازم آجاتا ہے۔

ح۱ ان تمام اختلافات پر جامعہ اور معارف میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ لہٰذا از سرِ نو اس بحث کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ پرویز۔

سب سے بڑی ضرورت جس کا احساس ایک عرصہ سے پیدا ہو رہا ہے۔ تبویب القرآن ہے۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کے مضامین جس انداز و طریق سے قرآن میں رکھے ہیں اس سے بہتر ترتیب پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن اس کے فہم کے لئے تدبر فی القرآن کی بڑی ضرورت ہے اس کے لئے قرآن پر اتنا عبور ہونا چاہئے کہ بیک وقت تمام قرآن کے مختلف مقامات جنمیں یہ مضامین بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح زینت نگار ہیں نظر کے سامنے آجائیں لیکن یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں جب قرآن سے لوگوں کو شغف تھا۔ اس کی تلاوت زندگی کے لوازم میں سے تھی۔ لیکن آج تو صورت ہی جداگانہ ہے۔ آج یہی نہیں کہ مریض کو مرض کا احساس نہیں ہے بلکہ وہ دوا کے نام سے کوسوں بھاگتا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ دوا کو خوش منظر و خوش ذائقہ بنایا جائے۔ کنین کی گولی پر شکر کا غلاف چڑھایا جائے۔ جب وہ قرآن کے پاس ہی مشکل آتے ہیں تو ان سے یہ توقع رکھنی کہ اس پر عبور حاصل کر کے اس کے حقائق و معارف سے لذت اندوز ہوں، عبث ہے اس لئے بنا بر ضرورت، ان کے لئے قرآن کو اس شکل میں پیش کر دینا چاہئے کہ اس میں ایسا ربط پیدا ہو جائے جیسا انسانی کلام میں ہوتا ہے۔ میں خود ایک مدت سے اس خیال میں ہوں کہ قرآن کریم کا ایک ایسا انسائیکلو پیڈیا تیار ہو جائے کہ تمام قرآنی تعلیم مختلف عنوانات کے ماتحت ایک وقت سامنے آجایا کرے۔ خدا کرے میرے اس خواب کی تعبیر کبھی سچی نکل آئے۔ وما توفیقی الا باللہ۔ تبویب القرآن پر دو ایک کتابیں نظر سے بھی گذریں لیکن "تعلیمات قرآن" میں جس ترتیب کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نہایت عمدہ ہے چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ جس حلقہ میں قرآن پہنچانے کے لئے بڑی دقت کا سامنا ہوتا تھا، انہوں نے اس کتاب کو دلچسپی سے پڑھا ہے۔

بہر حال کتاب ابھی نقش اوّل ہے اور اس میں بڑی وسعتوں کی گنجائش ہے۔ آئندہ اس میں انہی عنوانات پر اور ابواب کا بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور فہرست مضامین تو اس سے کہیں مفصل ہو سکتی ہے۔ با ایں ہمہ کتاب بطور (Reference Book) بھی نہایت کارآمد ہے اور اس نے ایسی دقتوں کو

رفع کردیا ہے جو مدت سے محسوس ہو رہی تھیں۔ قرآن سے شغف رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ ہے

میرا مقصد اس تعارف سے صرف یہ ہے کہ مولانائے موصوف نے جس عمارت کا خاکہ کھینچا ہے۔ چونکہ وہ نہایت اہم اور وقت کی اشد ضروریات کو پورا کرنے والی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ جذبات کے سیلاب میں یہ نقوش بہ جائیں۔ کتاب بہرکیف انسانی دل و دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جس میں سہو و خطا اور رجحان قلبی کا یقیناً امکان ہے۔ اس لئے اختلافی مسائل میں بجائے ذاتیات میں الجھنے کے، متانت اور سلامت روی سے تدبر کرنا چاہئے۔ اور خواہ مخواہ مؤلف پر بدنیتی کا الزام نہیں دھر دینا چاہئے کیونکہ انکا اپنا بیان ہے کہ

> قرآن کے اندر نہ میں خود اپنا خیال لے کر گھسا ہوں نہ کسی کے خیال کی پرواہ کی ہے۔ بلکہ دیانتداری کیساتھ قرآن کو خود قرآن ہی سے اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے ص۱

پھر اس میں اگر کوئی غلطی معلوم ہو تو اسے بھی نیک نیتی کے ساتھ ظاہر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اس بارہ میں بھی مؤلف کا خود اعلان ہے کہ

> جہاں جہاں مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں اگر طالبین قرآن ان سے مجھکو مطلع فرمائیں گے تو میں ممنون ہونگا۔ اور انشاء اللہ اپنے خیال اور کتاب دونوں کی اصلاح کرونگا (ص۱۱)

لہذا قطع نظر ان تمام فرعی اختلافات کے جو مولانائے موصوف سے کسی کو ہوں، انکا حسن اقدام مبارکباد کا مستحق ہے کیونکہ انہوں نے ایک ایسے اہم کام کی داغ بیل ڈالی ہے۔ جو انفرادی کوششوں کا نہیں بلکہ ایک جماعت کے کرنیکا تھا۔ اور اگر فرعی اختلافات مٹ جانے کے بعد اپنی بنیادوں پر یہ عمارت مکمل ہوگئی تو شاید اس کے صدقے میں وہ غفور رحیم ہم سے اس غضب کو اٹھائے جس میں آج ہم مبتلا ہیں۔ اور شاید کبھی ہم پھر بھی یہ کہنے کے قابل ہوسکیں کہ

زمین از گردش تقدیر ما گردون شود روزے   فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

(اقبال)

حدیث کے متعلق چند سوالات

ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"منکرین حدیث کے جواب میں آپکا فاضلانہ مضمون مندرجۂ ترجمان القرآن پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ اسی سلسلہ میں اگر جناب ذیل کے امور پر مزید روشنی ڈالیں تو ذی علم احباب کے لئے عموماً اور ناظرین رسالہ کے لئے خصوصاً بہت ہی مفید ہوگا۔

(۱) حفاظت قرآن کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر کہ لا تکتبوا عنی سوی القرآن ایک ضروری احتیاط کی صورت پیدا کر دی تھی۔ صحابہ کرام قرأت و حفظ قرآن کما نزل کے لئے مامور تھے اور اسی پر عامل رہے باوجود اس کے اختلاف قرأت پیدا ہوا جس کا دفعیہ بعہد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ احادیث بمقابلہ قرآن ویسی محفوظ و مثبوت نہیں ہو سکتیں خصوصاً جبکہ فتن جمل وصفین کے بعد مدت تک ان کی جمع و تنقید کی مختلف ذرائع سے کوشش کی گئی جبکہ طرق، رواۃ اور موضوعات کی چھان بین بہت مشکل تھی۔

(۲) احادیث فعلی اور قولی میں سے بہت سی ایسی ہیں جن کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہئے۔ مثلاً احادیث فعلی میں سے کیفیت و ہئیت نماز کے متعلق عقل چاہتی ہے کہ مطلقاً کسی قسم کا اختلاف نہ ہو خصوصاً جب کہ ارشاد نبوی تھا کہ صلوا کما رأیتمونی

اصلی کم از کم حرمین شریفین میں دن رات میں پانچ مرتبہ ایک گروہ کثیر ہر زمانہ میں متواتر اس عمل کو مشاہدہ کرتا رہا۔ مگر ابتدائے زمانہ ہی میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف جو بصورت رفع یدین۔ ارسال یدین۔ وضع یدین۔ تامین بالجہر وغیرہ ظاہر ہوا اس تواتر فعلی کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے اور تواتر قولی کی حیثیت اور بھی گر جاتی ہے خبر آحاد کا کیا کہنا۔

(۳) اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیوٰۃ طیبہ ہمارے لئے عملی طور پر سبق آموز ہے۔ قرون اولیٰ میں جبتک کہ جمع احادیث کا تسلی بخش اہتمام نہ ہو سکا، تو تین عظیم کے باہر مسلمان قرآن مجید ہی سے اسوۂ نبوی کا اقتباس کرتے تھے اخلاق رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا اور آپ نے جواباً فرمایا کان خلقہ القرآن غرض قرآن پاک سے اسلامی اخلاق اور زندگی کے معلوم کرنے کے لئے ذخیرہ وافر ہے۔ فی زمانہ بھی بہت تھوڑے ہیں جن کو پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی سوانح بالتفصیل والصواب معلوم ہوں مگر متبعین شریعت عموماً اصول و ارکان اسلام سے واقف ہیں اور یہی مقصود تھا لہذا مذکورہ بالا بعض منکرین حجیت حدیث کے شبہات ہیں جن کا ازالہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ ورنہ خاکسار ما اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا کو صحیح معنوں میں ہے کر حجیت حدیث صحیح کا قایل ہے۔

ترجمان القرآن ۔ آپ نے جن اعتراضات کی طرف توجہ دلائی ہے، ان کے علاوہ بیسوں اور اعتراضات بھی ہیں جو منکرین حدیث کی جانب سے پیش کئے جاتے ہیں مگر ان جزئی باتوں پر جدا جدا بحث کرنا طول کلام کا موجب ہے، اور غیر ضروری بھی۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کی رائے کا تمام تر انحصار اس کے

نقطۂ نظر پر ہے۔ جب کسی مسئلہ پر وہ مخالف نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتا ہے تو اس کو تمام مخالف ہی مخالف دلائل ملتے چلے جاتے ہیں۔ اور جب موافق نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو تمام دلائل موافقت ہی میں نظر آتے ہیں۔ مگر جب خالی الذہن ہو کر تلاش حق کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے تو موافق اور مخالف دونوں قسم کے دلائل پر اس کی نظر پڑتی ہے، اور دونوں میں موازنہ کر کے وہ ایک معتدل رائے قائم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اعدائے اسلام کے حملوں سے متاثر یا غیر محتاط علماء کی روایات سے برداشتہ خاطر ہو کر احادیث سے بدظن ہو چکے ہیں، وہ جب ایک مخالف نقطہ سے احادیث پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو حدیثوں کے ناقابل اعتماد اور ناقابل احتجاج ہونے کے لئے دلائل پر دلائل ملتے چلے جاتے ہیں۔ اور جو لوگ قدامت پسندی کے ماحول میں پرورش پائے ہوئے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ ہر حدیث کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو بے چون وچرا مان لیتے ہیں، خواہ وہ ضعیف بلکہ موضوع ہی کیوں نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ دونوں نقطۂ نظر غلط ہیں، اور جب نقطۂ نظر غلط ہیں تو جو کچھ ان نقطوں سے دیکھا گیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ تمام احادیث کو مطلقاً غلط سمجھنے والے بھی غلطی پر ہیں، اور تمام احادیث کو مطلقاً صحیح کہنے والے بھی۔ یہ لوگ بھی راہ راست سے ہٹ گئے ہیں جو احادیث اور قرآن مجید میں فرق نہیں کرتے اور وہ لوگ بھی گمراہی میں مبتلا ہیں جو احادیث کو قطعاً ناقابل احتجاج قرار دیتے ہیں۔ صحیح راستہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔ اور وہ درمیانی راستہ نظر نہیں آسکتا جب تک کہ دیکھنے والا ان متضاد نقطوں سے ہٹ کر وسط کے نقطہ پر نہ آجائے۔ پس اصلاح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جزئیات میں الجھنے کے بجائے انتہا پسندوں کے نقطۂ نظر پر براہ راست حملہ کیا جائے اور ان کو وہاں سے ہٹا کر صحیح نقطۂ نظر پر کھینچ لایا جائے۔

تاہم جب آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بیان کردہ اور پر روشنی ڈالی جائے، تو مختصراً میں ان پر اظہار رائے کئے دیتا ہوں۔

(۱) یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ احادیث اس حد تک محفوظ نہیں ہیں جس حد تک قرآن مجید ہے، مگر یہ خیال

صحیح نہیں ہے کہ وہ مطلقاً محفوظ ہی نہیں ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول او عمل ہم تک صحت کے ساتھ پہنچا ہی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ روایات کے طریقوں اور راویوں کے احوال کی چھان بین میں بہت دقتیں پیش آئی ہیں، اور ان میں محدثین کے درمیان اختلافات بھی ہوئے ہیں۔ مگر فن حدیث کی تاریخ شاہد ہے کہ محدثین نے تحقیق و تفتیش کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے، اور اس کام میں اتنی محنتیں کی ہیں کہ ان سے زیادہ انسان کے بس میں نہیں۔ انہوں نے اپنی ان محنتوں سے جو ذخیرہ فراہم کیا ہے، وہ آج ہمارے پاس موجود ہے، اور ان کے درمیان جو اختلافات ہوئے ہیں، وہ بھی تمام دلائل و شواہد کے ساتھ موجود ہیں۔ اگر کوئی اس ذخیرہ پر تحقیق کی نظر ڈالے تو اس کے لئے آج تیرہ سو برس گذر جانے کے بعد بھی یہ معلوم کرنا مشکل نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا اور کیا نہیں فرمایا۔ کیا کیا اور کیا نہیں کیا، اور یہ کہ ہر روایت جو آپ کی طرف منسوب ہے وہ اپنی صحت اور اپنے قابل احتجاج ہونے کے لحاظ سے کیا پایہ رکھتی ہے؟ لیکن یہ بات ناقابل انکار ہے کہ علم کا جیسا مستند اور معتبر ذریعہ قرآن مجید ہے ویسا مستند اور معتبر ذریعہ حدیث نہیں ہے۔ اس لئے صحت کا اصلی معیار قرآن ہی ہونا چاہئے۔ جو چیز قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے مخالف ہوگی اسے ہم یقیناً رد کر دیں گے، اور اس کا مخالف قرآن ہونا ہی اس امر کا بین ثبوت ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ چیز ہرگز ثابت نہیں ہے۔ اور جو چیز قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے موافق ہوگی، اور تعلیمات قرآن کی ایسی تشریح و توضیح یا احکام کی ایسی تفصیل ہوگی جو قرآن کے الفاظ یا اسپرٹ کے خلاف نہ ہو، اور روایت و درایت کے طریقوں سے اس کے معتبر ہونے کا ظن غالب بھی حاصل ہو جائے گا اس کو ہم ضرور تسلیم کریں گے، اور اپنی عقلی تفسیر و تشریح اور اپنی رائے پر اس کو ترجیح دیں گے۔

(۲)۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی فعلی اور قولی احادیث کو تواتر کا درجہ حاصل ہونا چاہئے جن کے دیکھنے اور سننے والے بکثرت ہوں، اور ان میں اختلاف نہ پایا جانا چاہئے لیکن ہر شخص بادنی تامل

سمجھ سکتا ہے کہ جس واقعہ کو بکثرت لوگوں نے دیکھا ہو، یا جس تقریر کو بکثرت لوگوں نے سنا ہو، اس کو نقل کرنے یا اس کے مطابق عمل کرنے میں سب لوگ اس قدر متفق بھی نہیں ہوسکتے کہ ان کے درمیان یک سر مو فرق نہ پایا جائے۔ اس واقعہ یا اس تقریر کے اہم اجزا میں تو سب کے درمیان ضرور اتفاق ہوگا، مگر فرعی امور میں بہت کچھ اختلاف بھی پایا جائیگا، اور یہ اختلاف ہرگز اس بات کی دلیل نہ ہوگا کہ وہ واقعہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔ مثال کے طور پر میں آج ایک تقریر کرتا ہوں۔ ہزار آدمی اس کو سنتے ہیں، اور جاکر لوگوں سے بیان کرتے ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ ہر شخص اس کو لفظ بلفظ نقل کردے۔ کوئی کسی ٹکڑے کو بیان کریگا، کوئی کسی دوسرے ٹکڑے کو۔ کوئی کسی جملے کو لفظ بلفظ نقل کریگا، کوئی اس مفہوم کو جو اس کی سمجھ میں آیا ہے اپنے الفاظ میں بیان کرے گا۔ اب اگر کوئی شخص اس اختلاف کو دیکھ کر یہ کہدے کہ میں نے سرے سے کوئی تقریر ہی نہیں کی، یا جو تقریر کی تھی وہ از سرتاپا غلط نقل کی گئی تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر اس تقریر کے متعلق تمام اخبار آحاد کو جمع کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ اس امر میں سب کے درمیان اتفاق ہے کہ میں نے تقریر کی، فلاں جگہ کی، فلاں وقت کی، بہت سے آدمی موجود تھے، اور تقریر کا موضوع یہ تھا۔ پھر تقریر کے جن جن حصوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ اتفاق، لفظاً یا معنیً پایا جائیگا۔ وہ زیادہ مستند سمجھے جائیں گے اور ان سب کو ملاکر تقریر کا ایک مستند مجموعہ مرتب کرلیا جائے گا اور جن حصوں کے بیان کرنے میں ہر راوی منفرد ہوگا وہ نسبۃً کم معتبر ہونگے۔ مگر ان کو غلط اور موضوع کہنا جائز نہ ہوگا تاوقتیکہ وہ تقریر کی پوری اسپرٹ کے خلاف نہ ہوں، یا کوئی اور ایسی بات ان میں نہ ہو جس کی وجہ سے ان کی صحت مشتبہ ہوجائے۔

یہی حال احادیث فعلی کا بھی ہے۔ آپ نے نماز کی مثال پیش فرمائی ہے میں بھی اسی مثال کو سامنے رکھ کر جواب عرض کرتا ہوں۔ نماز کے متعلق تواتر قولی و عملی سے یہ بات متفقہ طور پر ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانچ وقت کی نماز فرض ادا فرماتے تھے، نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی

مقتدی آپ کے پیچھے صف بستہ کھڑے ہوتے اور آپ کی حرکات و سکنات کی پیروی کرتے تھے۔ آپ قبلہ کی جانب رخ فرمایا کرتے۔ تکبیر تحریمہ کے ساتھ نماز میں داخل ہوتے، قیام، رکوع، سجود، اور قعود سے نماز مرکب ہوتی تھی۔ ہر رکن نماز کی فلاں فلاں ہیئتیں تھیں۔ غرض نماز کے جتنے اہم اجزاء ترکیبی ہیں ان سب میں تمام زبانی روایات متفق ہیں اور عہد رسالت سے آج تک ان کے مطابق عمل بھی ہو رہا ہے۔

اب رہے جزئیات مثلاً رفع یدین وارسال یدین، ووضع یدین وغیرہ تو ان کا اختلاف اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ مختلف لوگوں نے مختلف اوقات میں حضور صلی اللہ علیہ سلم کا عمل مختلف دیکھا ہوگا۔ چونکہ یہ امور نماز میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے، اور ان میں سے کسی کے کرنے یا نہ کرنے سے نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، اور حضورؐ خود صاحب شریعت تھے، اس لئے آپ جس وقت جیسا چاہتے عمل فرماتے تھے، لیکن حضور کے سوا کوئی اور شخص صاحب شریعت نہیں ہے، اور اس کا کام اتباع ہے نہ کہ تشریع، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ آپ کا زیادہ سے زیادہ صحیح اتباع کرنے کی کوشش کریں، اور احادیث کا تتبع کر کے معلوم کریں کہ ہر جزئیہ کے متعلق زیادہ صحیح اور مستند روایات کونسی ہیں۔ اس باب میں اختلاف رائے ممکن ہے، اور ہوا بھی ہے۔ کسی نے کسی روایت کو زیادہ مستند سمجھا اور کسی کو اس کے خلاف روایت پر اطمینان حاصل ہوا۔ مگر یہ اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اور یہ ہرگز اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ ادائے نماز کے متعلق سرے سے کوئی قولی و فعلی تواتر ہی نہیں پایا جاتا۔

(۳) قرآن پاک اور حدیث نبوی کے تعلق کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھنے سے تیسرا سوال پیدا ہوا ہے قرآن پاک میں سب سے زیادہ زور ایمان پر دیا گیا ہے، اور ایمان ہی کی تفصیلات سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ اس کے لئے تو ہمیں قرآن سے باہر جانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں، اور حدیث میں اس سے زیادہ کوئی چیز ملتی بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد اخلاقی تعلیمات ہیں، قرآن میں اصول اخلاق قریب قریب سب کے

بیان کر دیے گئے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اخلاق کا تعلق لفظی بیان سے اتنا نہیں ہے جتنا عملی نمونہ سے ہے۔ اس لئے خداوند تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو اخلاق کا مجسم نمونہ بنا کر پیش فرمایا۔ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور اپنے مواعظ، اور اپنی تعلیم حکمت اور عملی تربیت (تزکیہ نفس) سے ان تمام اصول اخلاق کی قولی و عملی تشریح فرما دی جو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں پس جو شخص اس اسوۂ نبوی کو چھوڑ کر کہتا ہے کہ اس باب میں ہمارے لئے صرف قرآن کافی ہے وہ اپنے آپ کو بہت بڑی نعمت سے محروم کرتا ہے،، بلکہ درحقیقت وہ حق تعالیٰ کے اس فعل کو عبث سمجھتا ہے کہ اس نے تنزیل کتاب کے ساتھ رسول بھی مبعوث فرمایا، اور یہ کہکر مبعوث فرمایا کہ ہمارا رسول نہ صرف تم کو ہماری آیات سنائیگا۔ بلکہ تمہارا تزکیہ نفس بھی کریگا۔ اور تم کو کتاب و حکمت کی تعلیم بھی دیگا۔ اور اس کی زندگی میں تمہارے لئے اسوہ حسنہ بھی ہوگا۔

اب رہ گئے احکام تو قرآن مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلّی قوانین بیان کئے گئے ہیں، اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا۔ اور اپنے عمل اور قول سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں سے بعض ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں، ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل حضور سے ثابت ہے اسی کی پیروی کریں۔ مثلاً عبادات کے احکام۔ اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم اصول اخذ کرکے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں، مثلاً عہد نبوی کے قوانین مدنی۔ اور بعض تفصیلات ایسی ہیں کہ ان سے ہم کو اسلام کی اسپرٹ معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ اسپرٹ ہمارے قلب و روح میں جاری و ساری ہو جائے تو ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ زندگی کے جملہ معاملات اور مسائل پر ایک مسلمان کی سی ذہنیت اور ایک مسلمان کی سی بصیرت کے ساتھ غور کریں دنیا کے علمی و عملی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں اور ان کے متعلق ویسی ہی رائے قائم کریں جیسی ایک مسلمان کو کرنی چاہئے۔

اس سے واضح ہوگیا کہ پورا اور پکا مسلمان بننے کے لئے قرآن مجید کے ساتھ حدیث کا علم کس قدر ضروری ہے۔اس کے جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ ایک عام مسلمان حدیث کے علم کے بغیر ایک مسلمان کی سی زندگی بسر کرتا ہے، تو میں کہوں گا کہ یہ علم حدیث کی ضرورت نہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے، اور اگر یہ دلیل ہے تو یہی دلیل قرآن کے علم کی ضرورت نہونے پر بھی قائم کی جاسکتی ہے کیونکہ ایک عامی مسلمان قرآن کے علم سے بھی بہت کم بہرہ ور ہوتا ہے اور پھر بھی اپنی زندگی میں احکام شریعت کا اتباع کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ عامی لوگ نہ کبھی عہد نبوی میں معیاری مسلمان تھے اور نہ اس کے بعد کبھی ان کو معیاری مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہوا۔معیاری مسلمان تو دراصل اس زمانے میں بھی وہی تھے اور اب بھی وہی ہیں جو قرآن اور حدیث کے علوم پر نظر رکھتے ہوں، اور جن کی رگ وپے میں قرآن کا علم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا نمونہ سرایت کرگیا ہو۔باقی رہے عوام تو وہ اس وقت بھی ان معیاری مسلمانوں کے پیرو تھے، اور آج بھی ہیں۔عہد نبوی میں جن صحابہ نے جتنا زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحبت اور تعلیم کا فیض اٹھایا وہ اتنے ہی زیادہ معیاری مسلمان سمجھے گئے، اور ان کے مقابلہ میں کبھی ان لوگوں کو باعتبار علم یا باعتبار عمل، ترجیح نہیں دی گئی جنہوں نے آنحضرت سے تعلیم او صحبت کا فیض نہ اٹھایا تھا۔بلاشبہ مسلمان دونوں تھے۔مگر دونوں کے مراتب کا فرق کبھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

تقریظ و انتقاد

تعلیماتِ قرآن

تالیف مولنا اسلم جیراجپوری ضخامت ۲۲۸ صفحہ قیمت عہ پتہ: قرول باغ دہلی۔

قرآن کریم کی آیات کو مضامین کے اعتبار سے مرتب کرنے کی متعدد کوششیں ابتک کی جاچکی ہیں اور اس سلسلہ میں بعض اچھی کتابیں شایع بھی ہوی ہیں۔ لیکن اس کتاب میں آیات قرآنی کو صرف مضامین کے اعتبار سے مرتب کردینے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس ترتیب سے نتائج اخذ کرنے اور مختلف مسائل کے متعلق قرآن کی تعلیمات کو ایک مسلسل اور مرتب بیان کی صورت میں پیش کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے تاکہ پڑھنے والا ایک نظر میں قرآن کے مقصود و مدعا کو معلوم کرسکے۔ اس طرح یہ کتاب محض تبویب القرآن ہی نہیں ہے بلکہ تفسیر القرآن بالقرآن بھی ہے۔ اس میں شک نہیں، جیسا کہ جناب مؤلف نے خود اعتراف فرمایا ہے کہ اس قسم کی کوئی کتاب انسان کو قرآن سے بے نیاز نہیں کرسکتی۔ کیونکہ قرآن تو ایک بحر بے کنار ہے جس کے مضامین کو عنوانات کی قید میں لانا بہت مشکل ہے لیکن آج کل جبکہ ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ حضرات قرآن مجید کا تفصیلی مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں رکھتے، ایسی کتابوں کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا جن میں قرآن کی تعلیمات کا نچوڑ خود قرآن ہی کے الفاظ میں پیش کردیا گیا ہو تاکہ وہ قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ایک تفہیمی مقدمہ کا کام دے سکیں۔

زیر نظر کتاب میں مؤلف نے قرآنی تعلیم کے چھ اہم ترین مسئلوں کو بیان کیا ہے۔ خالق، مخلوق، دین، رسالت، کتاب اور معاد۔ ان میں سے ہر عنوان کے تحت انہوں نے متعدد ذیلی عنوانات قائم کرکے

ایک سلسلہ کے ساتھ آیات قرآنی درج کی ہیں اور بیچ بیچ میں مختصر تفسیری و تشریحی جملے بھی لکھدئے ہیں جن سے خیالات کا ربط اور تسلسل قائم ہونے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے الفاظ اور بیانات کو کم سے کم جگہ دی ہے۔ اور بڑے بڑے مباحث کو سمیٹ کر چھوٹے چھوٹے جملوں میں ادا کر دیا ہے۔

قرآن کریم کی خدمت سے زیادہ مبارک خدمت دنیا میں کوئی نہیں ہے، اور جو شخص اس خدمت کو انجام دے، وہ اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کا شکریہ ادا کریں، اور اس کے کام کی قدر کریں لیکن یہ خدمت جتنی مبارک ہے اتنی ہی نازک بھی ہے۔ قرآن کی نسبت سے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے، وہ مسلمانوں کے خیالات اور عقاید پر بہ نسبت دوسری چیزوں کے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لئے جو چیز بھی قرآن کی نسبت سے پیش ہو اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ پیش کرنے والے کا بھی فرض ہے کہ وہ ہر بات اور ہر مسئلے کی صحت کا زیادہ سے زیادہ اطمینان کرے اور دوسروں کا بھی فرض ہے کہ اگر کوئی فروگذاشت ان کو نظر آئے تو نکتہ چینی و خردہ گیری کی نیت سے نہیں بلکہ خدمت قرآن کی نیت سے اس کو واضح کر دیں تاکہ آیندہ اس کی تصحیح ہو سکے۔ مولف کی علمی شان سے ہمکو توقع ہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے پوری احتیاط برتی ہوگی، اور وہی پیش کیا ہوگا جو ان کے نزدیک صحیح تھا، لیکن ہمارے نزدیک کتاب میں اب بھی متعدد فروگذاشتیں رہ گئی ہیں۔ اس لئے ہم بھی نہیں پیش کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ اگر جناب مولف ہمارے کسی بیان سے مطمئن نہ ہو سکیں تو انھیں حق ہے کہ ہم سے مزید تبیین کا مطالبہ کریں۔

جن و انس | صفحہ ۲۰ پر جن و انس کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ دونوں لفظ جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن کے معنی اس آتشیں جن کے نہیں ہیں بلکہ انسانوں ہی کے ایک طبقہ کے ہیں"۔ یہ تشریح غالباً اس شبہ کو رفع کرنے کے لئے کی گئی ہے جو حضرت سلیمانؑ کے لشکر میں جنوں کے شریک ہونے پر عموماً کیا جاتا ہے لیکن جس آیت پر یہ نوٹ لکھا گیا ہے اس میں "جن اور انس کے ساتھ "طیر" کو بھی حضرت سلیمانؑ کے لشکروں میں شامل کیا گیا ہے۔ کیا یہ طیر بھی انسانوں ہی کا کوئی طبقہ تھا؟ پھر دوسری جگہ بیان کیا گیا

ہے کہ ہوا حضرت سلیمانؑ کے تابع کی گئی تھی؟ وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ۔ کیا ہوا سے مراد بھی انسانوں کا کوئی طبقہ لیا جا سکتا ہے؟ جب ایسا نہیں ہے تو محض لفظ جن کی تاویل کرنے سے کیا حاصل؟ تاویل تو ایسی ہونی چاہئے جو قرآن کے دوسرے بیانات سے مطابقت رکھتی ہو۔ قرآن مجید میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ شیاطین حضرت سلیمان کے تابع تھے وَالشَّيَاطِيْنَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَّغَوَّاصٍ۔ دوسری جگہ شیطان کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وہ جن تھا۔ كَانَ مِنَ الْجِنِّ۔ تیسری جگہ جنوں کے متعلق فرمایا گیا ہے وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ۔ اور چوتھی جگہ شیطان کی حقیقت خود اس کی زبان سے یہ بیان کرائی گئی ہے کہ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ۔ ان سب بیانات سے متحقق ہو جاتا ہے کہ جو جن حضرت سلیمان کے تابع کئے گئے تھے وہ آتشیں مخلوق ہی تھے۔ مگر وہ کیسے جن تھے؟ اور ان کی ماہیت کیا تھی؟ یہ ہم کو نہیں بتایا گیا اور جب اس راز کو کھولا نہیں گیا تو محض قیاس آرائی سے ہم کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔

جناب مؤلف کا یہ کلیہ بھی صحیح نہیں ہے کہ جہاں جہاں جن اور انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن سے مراد انسانوں ہی کا ایک طبقہ ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ، اور وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَا اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اور وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ میں اگر جنوں سے انسانوں ہی کا کوئی طبقہ مراد ہے تو اس کو انسان ہی کیوں نہ کہا گیا۔ جن کے جداگانہ لفظ سے کیوں تعبیر کیا گیا۔ اور اگر وہ انسانوں ہی کا کوئی الگ طبقہ ہے تو آخر وہ کونسا طبقہ ہے؟ غالباً مؤلف نے ان لوگوں کی رعایت مدنظر رکھی ہے جن کو "جن" نامی ایک آتشین مخلوق کے وجود سے انکار ہے۔ مگر شاید انہوں نے غور نہیں فرمایا کہ ان لوگوں کے دلائل علمی حیثیت سے بہت کمزور ہیں۔ اتنے کمزور کہ ان سے مرعوب ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ایسی باتوں سے مرعوب ہونے کا زمانہ مدت ہوئی کہ گذر گیا۔

قب
معنی خلا مؤلف نے ہر جگہ خلافت کے معنی بادشاہی کے لیے ہیں اور صفحہ ۴۶ پر اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کا ترجمہ "میں زمین میں ایک بادشاہ بنانے والا ہوں" کرکے اس پر نوٹ لکھا ہے کہ :-

> خلافت کے معنی جانشینی کے ہیں ۔ اور خلافت فی الارض کے معنی ایک کی جگہ دوسرے کو زمین کا بادشاہ بنانا ہیں ۔
>
> ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِھِمْ لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ پھر ان کے بعد زمین میں ہم نے تم کو جانشین بنایا کہ دیکھیں تم کس طرح کام کرتے ہو ۔
>
> حضرت آدم اپنے سے پہلے ساکنان زمین کے بجائے بادشاہ بنائے گئے تھے ۔ نیابت حق یا خلافت الٰہی کا خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ اللہ جس کی شان یہ ہے کہ وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ اس کا جانشین کوئی کیونکر ہو سکتا ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ اس آیت کی وہ تفسیر بھی ہو سکتی ہے جو مؤلف نے کی ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک قول اسی معنی میں منقول ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس کی تفسیر خلافت الٰہی سے کرنا غلط ہے ۔ بات یہ ہے کہ آیت میں صرف لفظ "خلیفہ" آیا ہے جس کے معنی جانشین، نائب اور قائم مقام کے ہیں اس کے ساتھ کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے صریح مفہوم یہ نکلتا ہو کہ میں ان لوگوں کی جگہ ایک دوسری مخلوق کو بادشاہ بنانے والا ہوں جو اب تک زمین میں بستے تھے"۔ بلکہ آیت کے الفاظ سے صرف یہ مفہوم نکلتا ہے کہ "میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں" اس کی تاویل اگرچہ وہ بھی کی جاسکتی ہے جو مؤلف نے کی ہے ۔ مگر اس کی یہ بھی تاویل کی جاسکتی ہے کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت سے سرفراز کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا ۔ اس تاویل میں جو قباحت مؤلف نے ظاہر کی ہے وہ محض لفظ "جانشین" سے پیدا ہوگئی ہے ۔ حالانکہ اگر وہ اگر خلیفہ کا ترجمہ "نائب" کرتے تو کوئی قباحت نہ رہتی ۔ اگرچہ حق تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے لیکن پردہ میں ہے ۔ اور پردہ میں رہنے والے کی نیابت، پردہ کے باہر رہنے والا کر سکتا ہے ۔ اس نیابت کے تخیل میں جو رفعتیں ہیں

وہ پرانے ساکنین ارض کی جانشینی کے تخیل میں ہرگز نہیں ہیں۔ کاش مولانا لفظی قیود سے بالاتر ہو کر معانی کے عالم میں ان دونوں مفہوموں کا فرق ملاحظہ فرماتے۔

قرآن مجید کی بکثرت آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ خلافت سے مراد زمین میں خداوند تعالٰی کی نیابت ہی ہے۔ جگہ جگہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی و برتری دی (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ) اور ہم نے ان کو بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی (وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا) اور زمین میں جو کچھ ہے ان کے لئے مسخر کر دیا (سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ)۔ پھر فرمایا گیا کہ جس بار امانت کو سنبھالنے کی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کی مخلوق کو ہمت نہ ہوئی تھی، وہ بار انسان نے اٹھا لیا۔ اس سلسلہ کی تمام آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے علم، اپنی قدرت، اپنی عقل، اپنی قوت تمیز اور اپنی حاکمانہ برتری کے اعتبار سے تمام ان مخلوقات پر فوقیت رکھتا ہے جو زمین اور اس کے ماحول میں موجود ہیں، اور اسی برتری کے اعتبار سے اس کو مجازاً نہ کہ حقیقی لغوی معنوں میں "خلیفۂ خدا" کہا گیا ہے۔ اس خلافت کے مقام اور حیثیت سے آگاہی بخشنے کا مقصود دراصل یہ جتانا ہے کہ نائب ہونے کی حیثیت سے انسان کو اپنے محکوموں اور اپنی تابع فرمان اشیاء کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرنا چاہئے جیسا کہ خود رب العالمین کا معاملہ ان کے ساتھ ہے۔ اَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ کی آلہی نصیحت اسی اصل پر مبنی ہے۔

آدم کا گناہ صفحہ ۸۰ پر لکھا ہے کہ "آدم کے گناہ کو اللہ نے معاف نہیں کیا ورنہ ان کو جنت سے نہ نکالتا۔ صرف ان کی توبہ قبول کی" یہ تفسیر بالرائے کی ایک بری مثال ہے۔ توبہ قبول کرنے کا مفہوم گناہ معاف کر دینے کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ اگر ہے تو اسے واضح کیا جائے۔ حضرت آدم کے متعلق حق تعالٰی نے تو فرمایا ہے کہ نہ صرف ان کی توبہ قبول کی گئی بلکہ ان کو برگزیدہ کیا گیا اور انہیں ہدایت بخشی گئی (ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى)۔ پھر صفحہ ۱۳۹ پر خود مؤلف نے آدم کے نبی ہونے کا احتمال ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ حق تعالٰی نے آدم کا گناہ معاف نہیں کیا؟

رہا یہ سوال کہ اگر حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو معاف کر دیا تھا تو انہیں جنت سے کیوں نکال دیا؟ تو اس کا جواب خود قرآن ہی سے مل جاتا ہے۔ قرآن میں یہ کہاں ارشاد ہوا ہے کہ آدم جنت میں رہنے کے لئے پیدا کئے گئے تھے؟ وہاں تو صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جب آدم کا ہیولیٰ تیار ہوا تھا اسی وقت ان کو زمین کی خلافت دینے کا ارادہ ظاہر کر دیا گیا تھا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ اس تصریح کے بعد اس شبہ کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے؟

قبول توبہ اور عفو تقصیر میں جو فرق مولٰنا نے کیا ہے وہ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ جہاں جہاں قرآن میں توبہ قبول کرنے کا ذکر آیا ہے وہاں اس سے مراد عفو تقصیر ہی ہے، اور یہ اسلام کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے کہ وہ کفار و مشرکین تک کو یہ امید دلاتا ہے کہ اگر تم سچے دل سے توبہ کرو اور اپنے گناہ سے باز آجاؤ تو خدا تمہارے پچھلے قصور معاف کر دیگا۔ یہ رحمت اور عفو و کرم کا دروازہ جو اسلام نے کھولا ہے، وہ اس تفریق سے بند ہو جاتا ہے جو قبول توبہ اور عفو گناہ میں کی گئی ہے۔

غلامی کا مسئلہ صفحہ ۵۵ پر مولٰنا نے لکھا ہے:۔

"ایک انسان کا دوسرے کو غلام بنانا فطرت کے خلاف ہے لیکن دنیا میں غلامی رائج ہو گئی تھی اور نزول قرآن کے زمانے میں عربوں کے پاس بھی مملوک تھے قرآن نے بعض مصالح کی وجہ سے ان مملوکوں پر جو ان کی غلامی میں آچکے تھے ان کی ملکیت کو بدستور رہنے دیا۔"

اس کے بعد انہوں نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ:۔

قرآن میں جہاں بھی مملوکوں کا ذکر ہے بصیغہ ماضی یعنی ماملکت ایمانکم ہے بصیغہ مستقبل کہیں نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن غلاموں کے وہ مالک ہو چکے تھے صرف انہی کی ملکیت قائم رکھی گئی تھی۔"

یہ متن اور حاشیہ دونوں نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں انسانی کمزوریوں کا لحاظ رکھ کر تدریجی طریقے سے اصلاح کی گئی ہے لیکن کوئی مثال قرآن میں ایسی نہیں ملتی کہ کسی مسئلے میں اپنی تدریجی اصلاح کو نامکمل چھوڑ دیا ہو اور آخری اصلاح کا حکم نزول وحی کے زمانہ ہی میں نہ دے دیا ہو۔ یہ قاعدہ کلیہ اگر درست ہے تو کیا غلامی کے مسئلہ میں قرآن مجید کا کوئی ایسا حکم دکھایا جا سکتا ہے جس نے غلامی کی ہر شکل کو قطعی طور پر ممنوع قرار دیا ہو؟ رہی یہ بات کہ عرب میں چونکہ غلامی رائج تھی اور لوگوں کے پاس ممالیک موجود تھے اس لئے غلامی کو مصلحتاً باقی رکھا گیا، تو غور کرنے سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ ایسی مصلحت شناسی کو خدا کی طرف منسوب کرنا دراصل خدا کی طرف کمزوری کو منسوب کرنا ہے جس خدا نے شراب کو حرام کر دیا اور اس معاملہ میں بندوں کی خواہشات کی ذرا پرواہ نہ کی، جس نے زنا کو حرام کر دیا، اور اس امر کی ذرا پروا نہ کی کہ عرب اور دوسرے ممالک میں زنا کا کس قدر رواج تھا، اس کو کونسا امر غلامی کی ہر صورت کو قطعاً حرام کر دینے سے روک سکتا تھا؟

بات دراصل یہ ہے کہ غلامی کی دو صورتیں اس وقت دنیا میں رائج تھیں۔ ایک یہ کہ بعض ممالک کے آزاد باشندوں کو پکڑ کر ان کی خرید و فروخت کی جاتی تھی۔ دوسرے یہ کہ جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوتے تھے ان کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ ان دونوں شکلوں میں سے پہلی شکل کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً ممنوع قرار دیا اور فرمایا کہ جو شخص کسی آزاد کو پکڑ کر بیچے گا اس کے خلاف میں خود قیامت کے روز مدعی ہونگا۔ (بخاری کتاب البیوع) اور دوسری شکل کے متعلق اسلام کا قانون یہ قرار پایا کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوں ان کا یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے یا فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے یا دشمن سے مسلمان قیدیوں کے ساتھ ان کا مبادلہ کر لیا جائے لیکن اگر رہا کر دینا جنگی مصالح کے خلاف ہو، اور فدیہ وصول نہ ہو سکے، اور دشمن اسیران جنگ کا مبادلہ کرنے پر بھی راضی نہ ہو تو مسلمانوں کو حق ہے کہ انھیں غلام بنا کر رکھیں۔ البتہ اس قسم کے غلاموں کے ساتھ انتہائی حسن سلوک اور رحمت و رافت کے برتاؤ کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کو تعلیم و تربیت دینے اور

انہیں سوسائٹی کے عمدہ افراد بنانے کی ہدایت کی گئی ہے، اور مختلف صورتیں ان کی رہائی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ اس باب میں اسلام کا صحیح قانون معلوم کرنے کے لئے قرآنی احکام کے ساتھ نبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور آپ کے ارشادات، اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کے عمل کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ مؤلف کی غلطی کا اصل سبب یہی ہے کہ انہوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

مالکت ایمانکم سے جو نکتہ مؤلف نے پیدا کیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے نزول قرآن کے بعد بھی صحابہ کے عہد میں بہت سے اسیران جنگ کو ممالیک کی حیثیت سے رکھا گیا ہے۔ خود اہل بیت رسول کے گھروں میں جنگ سے پکڑے ہوئے غلام اور مفتوح ممالک سے آئی ہوئی لونڈیاں موجود تھیں۔ تو کیا ان سب لوگوں نے حکم قرآن کی دانستہ خلاف ورزی کی؟ یا یہ سب قرآن کے حکم سے ناواقف تھے؟

پھر اگر یہ قاعدہ بنا لیا جائے کہ جو کچھ قرآن میں بصیغۂ ماضی کہا گیا ہے اس سے مراد صرف ماضی ہی ہوگا، حال یا مستقبل نہ ہوگا، تو اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ کی تاویل آپ اس طرح کیوں کرتے ہیں کہ "جب قیامت آئے گی تو چاند پھٹ جائے گا" اور کَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ کا ترجمہ آپ نے "اس کا عرش پانی پر ہے" کیوں فرمایا ہے؟

آگے چل کر مؤلف نے حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً سے یہ استدلال کیا ہے کہ:-

> "غلامی کا صرف ایک ہی رستہ تھا یعنی اسیران جنگ۔ قرآن نے ان کو آزاد کرنے کا حکم دے کر ہمیشہ کے لئے اس راستہ کو بند کر دیا۔"

لیکن مولٰنا نے یہ غور نہ فرمایا کہ اگر کفار نہ مال کی صورت میں فدیہ دیں، اور نہ اسیران جنگ کا مبادلہ کریں، تو کیا ایسی صورت میں بھی مسلمانوں پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ وہ لازماً اسیران جنگ کو بطور احسان رہا کر دیں؟ اگر اسیران جنگ کو رہا کرنے سے دشمن کو مزید قوت پہنچنے کا خطرہ ہو، اور مسلمانوں کو اندیشہ ہو کہ

یہ لوگ آزاد ہوکر پھر ہم سے لڑنے آئیں گے تو کیا اس صورت میں بھی یہ حکم ہے کہ انھیں رہا کر دیا جائے؟ کم از کم آیت کے الفاظ سے یہ قطعی اور لازمی حکم نہیں نکلتا۔ آیت میں "منّاً" کا لفظ ہے جس کے معنی احسان رکھنے کے ہیں۔ اور قرآن میں کہیں احسان کا حکم نہیں دیا گیا ہے، بلکہ ہر جگہ اسے فضیلت کا درجہ دے کر اس کی طرف ترغیب دلائی گئی ہے اسی طرح یہاں بھی قرآن مجید کا مقصود یہ ہے کہ احسان رکھ کر چھوڑ دینا زیادہ افضل اور بہتر ہے لیکن اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اگر اسلامی مفاد کو نقصان پہنچتا ہو تب بھی احسان کیا جائے، اور ضروری کیا جائے۔

زمین کی ملکیت کا مسئلہ صفحہ ۵ پر مولف نے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ سے یہ حکم نکالا ہے کہ زمین پر شخصی ملکیت (زمینداری) ناجائز ہے چنانچہ اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ:-

> زمین کی وراثت کا جہاں جہاں قرآن میں ذکر ہے...... اس کے معنی حکومت کے ہیں شخصی ملکیت یعنی زمینداری کے نہیں ہیں۔ قرآن نے بجز حق انتفاع کے زمین پر حق ملکیت عطا نہیں کیا ہے۔"

یہاں پھر نکتہ آفرینی کی کوشش میں مولانا حق سے تجاوز کر گئے ہیں۔ انھیں غور فرمانا چاہیے تھا کہ زمین کی شخصی ملکیت کا دستور نزول قرآن کے وقت تمام دنیا میں رائج تھا صدیوں سے رائج چلا آرہا تھا۔ اور تمدن کے اساسی دستوروں میں داخل ہوگیا تھا۔ اگر قرآن کا مقصود فی الحقیقت اس نظام تمدن میں ایسی اساسی ترمیم کرنا ہوتا، اور اگر وہ فی الواقع زمین کی شخصی ملکیت کو مٹانا چاہتا جس کی جڑیں انسانی تمدن میں اتنی گہری جمی ہوئی تھیں، تو کیا ایسی انقلاب انگیز کارروائی کے لئے وہی زبان موزوں ہوسکتی تھی جو وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ میں استعمال کی گئی ہے؟ ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی اہم اور اساسی اصلاحوں کے لئے محض سرسری اشارے کافی نہیں ہوتے بلکہ صریح احکام دینے ضروری ہوتے ہیں پھر یہ بھی کافی نہیں ہوتا کہ محض سابق دستور کو مٹا دیا جائے، بلکہ اس کو مٹانے

کے ساتھ خود اپنی طرف سے ایک دوسرا دستور بھی پیش کرنا ہوتا ہے۔ اب کیا مولانا یہ بتا سکتے ہیں کہ قرآن نے شخصی ملکیت کا قاعدہ منسوخ کر کے کونسا دوسرا قاعدہ اس کی جگہ مقرر کیا؟ اور اگر قرآن کا منشا کوئی دوسرا قاعدہ مقرر کرنا ہی تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین نے شخصی ملکیت کے قدیم دستور کو کیوں باقی رکھا، اور خود لوگوں کو جاگیریں دیں؟

جس آیت سے مولانا استدلال فرما رہے ہیں اس کے الفاظ اور موقع و محل پر نظر کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا مقصود کوئی قانون بنانا نہیں ہے، بلکہ خدا کی قدرتوں کا بیان ہے ساری تقریر اس انداز پر ہے کہ "رحمان نے قرآن کا علم دیا" انسان کو پیدا کیا اسے بیان کی قوت دی۔ اسی کے حکم سے چاند سورج گردش میں ہیں۔ درخت اور گل بوٹے سب اسی کے آگے سربسجود ہیں۔ اس نے اوپر آسمان کو چھا دیا، اور نیچے خلقت کے فائدہ کے لئے زمین بچھا دی جس میں میوے اور کھجور کے درخت ہیں، اور طرح طرح کے اناج اور خوشبودار پھول ہیں اب تم اپنے پروردگار کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے" اس تقریر میں تمدنی قانون بیان کرنے کا کونسا موقع تھا؟ اور صرف یہ فقرہ کہ "نیچے خلقت کے فائدہ کے لئے زمین بچھا دی" یہ معنی کہاں دیتا ہے کہ زمین پر شخصی ملکیت ناجائز ہے؟ قرآن سے احکام نکالنے کے لئے ضروری ہے کہ آیت کے الفاظ اور اس کے موقع و محل اور سیاق و سباق کو پیش نظر رکھا جائے پھر اس امر کا بھی لحاظ کیا جائے کہ جو قانون ہم اس آیت سے اخذ کر رہے ہیں آیا اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں عملاً جاری بھی فرمایا تھا یا نہیں۔ اگر معلوم ہو کہ آپ نے ایسا قانون جاری نہیں فرمایا بلکہ آپ کا عمل اس کے خلاف رہا تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ بادی النظر میں قرآن کا جو مفہوم ہم سمجھ رہے ہیں۔ وہ غلط ہوگا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی لئے بھیجے گئے تھے کہ قرآن میں جو احکام دئے گئے ہیں ان پر عمل کر کے بتائیں اور زندگی کے معاملات میں ان کو جاری کردیں اگر آپ احکام قرآنی کے مطابق زندگی کے قدیم طریقوں میں اصلاح نہ فرماتے اور الٰہی قوانین کو نافذ کرنے کے بجائے پرانے دستوروں کی پیروی کرتے تو نعوذ باللہ آپ کی بعثت بالکل فضول ہوتی بلکہ بعثت کا اصل منشا ہی فوت ہوجاتا کم از کم اتنا تو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ آنحضرت صلعم کا کوئی عمل قرآن کے خلاف نہ تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔ باقی

نقد و نظر

۱۔ رسائل۔

جنوری سنہ رواں سے تین خاص رسالے جاری ہوئے ہیں خوشی کی بات ہے کہ یہ تینوں رسالے مذاق عام کے غلام نہیں ہیں۔

جاوید دہلی | مرتب۔ مولوی عبدالوحید صاحب صدیقی و مولوی محمد ادریس صاحب میرٹھی ضخامت ۶۲ صفحات سالانہ چندہ تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ ٹپیا محل دہلی۔

جاوید کے تین نمبر ہمارے پیش نظر ہیں۔ ہر نمبر سابقہ نمبر سے بہتر ہے مضامین زیادہ تر علمی اور مذہبی ہیں۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الادب دارالعلوم دیوبند جیسے علماء کی قلمی اعانت اس کو حاصل ہے۔ عام دلچسپی کیلئے کبھی ایک آدھ افسانہ کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ اگر جاوید اسی مسلک پر چلتا رہا تو ہم امید کرتے ہیں کہ وہ دین اور علم کی مفید خدمت انجام دیگا۔

کونین، گورکھپور | مرتب:۔ مولوی عزیز الرحمان صاحب اصلاحی و محمد یحییٰ صاحب اعظمی بی۔ اے ضخامت ۴۰ صفحات، سالانہ چندہ ۱۲؍ ملنے کا پتہ:۔ منیجر رسالہ کونین، کھوکھرپور۔ گورکھپور۔

اس رسالہ کا مقصد ایسے لوگوں کیلئے معلومات فراہم کرنا ہے "جو دنیا کے حالات سے بہت کم واقف ہیں"۔ اس لئے "زبان اور مضامین میں ایسے ہی لوگوں کے ذوق و رجحان کی پابندی" کی جاتی ہے۔ دینیات، سیاسیات، معاشیات، مختارات، وجدانیات، نسائیات، ادبیات، بصائر و حکم، تعلیم و تربیت، تاریخ و سیر، حوادث و ایام بعالم اسلام، زرعیات، اقتباسات اور معلومات اس کے مستقل عنوانات ہیں۔ اور ہر عنوان کے تحت مفید مضامین درج کئے جاتے ہیں۔ اس رسالہ میں ایک خاص چیز، مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر القرآن کے ایک جزو (سورۃ اللھب) کا ترجمہ ہے" جو تیسرے نمبر سے شروع ہوا ہے اور مسلسل شائع ہو رہا ہے

کو بہت بڑا کام کرے گا۔ اگر مولانا علیہ الرحمۃ کی تفسیر کے شایع شدہ اجزا کا ترجمہ شایع کرتا رہے گا۔

شہاب جونا گڈھ مرتبین:۔ مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی و قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑہی ضخامت ۴۸ صفحات سالانہ چندہ (عہ) روپیہ۔ ملنے کا پتہ دفتر شہاب کنگ روڈ جونا گڈھ کاٹھیاواڑ۔

اس رسالہ کے کاتب و مرتب ملک کے مشہور اہل قلم ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ کاٹھیاواڑ میں "اردو کی اشاعت کی جائے اور ایسے اسباب مہیا کئے جائیں جن سے اس زبان کی طرف لوگوں کو خود رغبت پیدا ہو"۔ اس پرچہ کے چھ خاص عنوانات ہیں: لمعات، اس کو معارف کے شذرات سمجھئے، مقالات، تاریخ۔ ادبیات منظومات۔ اور علمی خبریں۔ مقالات کے تحت پروفیسر سید محمد علی صاحب کا مضمون علم مواقیت الصلاۃ اور اسمٰعیل ابراہانی صاحب کا مضمون "انگریزی اعلیٰ تعلیم کا دردناک انجام" اور تاریخ کے تحت مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی کا مضمون "بوہرہ قوم کی اصلیت" قابل قدر مضامین ہیں۔

تحفہ معراج شریف از جناب حاجی رحیم بخش صاحب ایم۔ اے ضخامت ۱۳۱ صفحات اس رسالہ میں جناب حاجی صاحب نے نہایت قابلیت سے مسئلہ معراج پر گفتگو فرمائی ہے اور قرآن میں تدبر اور آیات کا تتبع کر کے ثابت کیا ہے کہ معراج جسمانی تھی۔ اور جو الفاظ قائلین معراج روحانی کے لئے محل شک ہوئے ہیں کلام عرب سے ان کے معنی کی تحقیق کی ہے۔ حق یہ ہے کہ حاجی صاحب کا یہ رسالہ اس باب میں قول فیصل ہے۔

مکتبۂ علمیہ

ایک مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم وفن کی اردو، عربی، فارسی اور انگریزی کتابیں مل سکتی ہیں۔ طلبہ کے لئے درسی کتابوں کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی حسب فرمایش کتابیں بھیجی جا سکتی ہیں

مکتبہ علمیہ۔ چارمینار حیدرآباد دکن

قواعد

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوا کریگا مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہونگی انکو پرچہ قیمتاً دیا جائیگا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام کسی طویل مدت کیلئے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہئے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کیلئے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں۔ لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن - خیرت آباد۔ حیدرآباد (دکن)

(طابع و ناشر ابوالاعلیٰ مودودی) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن